حالات حاضرہ اور مسلمان

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ
پوسٹ بکس نمبر ۹۳، ندوۃ العلماء لکھنؤ

بار دوم

۱۴۲۷ھ ـــــ ۲۰۰۶ء

نام کتاب ـــــــــــ حالات حاضرہ اور مسلمان

مصنف ـــــــــــ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

تعداد ـــــــــــ ۲۰۰۰

صفحات ـــــــــــ ۲۲۱

کمپوزنگ ـــــــــــ عطاء الرحمن

طباعت ـــــــــــ کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ

قیمت ـــــــــــ 65/روپے

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

P.B.N.119, Nadwat-Ul-Ulama
Lucknow. (U.P.) India
Tel. : 0522-2791559
Fax : 0522-2740806
E-mail : info@airindia.com

صفحہ نمبر	فہرست مضامین	نمبر شمار

باب اول
لائق توجہ امور حالات حاضرہ کے پس منظر میں

باب دوم
دینی تعلیم اور مدارس کی اہمیت

باب سوم
مسلم پرسنل لا اور اصلاح معاشرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب کے بارے میں

یہ کتاب ان مضامین اور خطابات پر مشتمل ہے جس میں صاحب مضامین نے گذشتہ دو تین سال کے دوران امت اسلامیہ کے حالات حاضرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے اسباب اور پھر مستقبل کی توقعات اور اس کی تعمیر ملت کے لئے تقاضائے وقت کے لحاظ سے مناسب طریقہ کار کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے، یہ مختلف موقعوں پر کئے گئے خطابات اور لکھے گئے مضامین ہیں، ان کو عزیزی مولوی محمد وثیق ندوی نے ان کی مطبوعہ جگہوں سے اکٹھا کیا اور انہوں نے اور عزیزی مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی نے اس کو بصورت کتاب طباعت کے لائق بنایا، میں ان کے شکریہ کے ساتھ عزیز محترم مولانا شمس الحق ندوی کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس کی ترتیب پر نظر ڈالی اور بعض مفید مشورے دیئے، میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کا بطور خاص شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس پر قیمتی مقدمہ تحریر کیا، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو ان کی توجہ وتعاون کی جزائے خیر دے۔ آمین

سید محمد رابع حسنی ندوی

ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۰ رشوال ۱۴۲۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

از: مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

(مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

عصر حاضر میں مسلمانوں کو خیر امت کی حیثیت سے مٹانے کی سازش ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، اسلام کے دور اول میں بھی یہودیت کے زیر سایہ اس طرح کے واقعات پیش آئے، اور بعد کی صدیوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، پانچویں صدی ہجری میں صلیبی جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، صلیبیوں نے عالم اسلام پر قبضہ کرنے اور امت مسلمہ کو فنا کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے نور الدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے بہادر اور جانباز حکمرانوں کو حملہ آور صلیبیوں سے مقابلہ کرنے اور ان کو شکست فاش دے کر عالم اسلام سے نکالنے کی ہمت و طاقت عطا فرمائی، انہوں نے بیت المقدس کو ان کے قبضے سے آزاد کرا کے تاریخ اسلام میں ایک زریں باب کا اضافہ کیا۔

لیکن ساتویں صدی ہجری میں پھر مسلمانوں کو ایک سخت فتنے سے دوچار ہونا پڑا، اور وہ تھا تاتاریوں کا فتنہ، عالم اسلام پر ان کی یورش اور قتل و خونریزی کی گرم بازاری، تاریخ ان کے سیاہ کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے پھر اسی حملہ آور قوم کے ایک حکمراں کے دل میں اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، اور شیخ جمال الدین نامی ایک بزرگ عالم کی اس کے

دربار تک رسائی ہوئی، اوران کے اثر سے یہ قوم اسلام کی نعمت سے نہ صرف یہ کہ سرفراز ہوئی بلکہ داعی اسلام بن کر ابھری۔

یہ دونوں واقعہ اسلام کے خلاف علی الاعلان جنگ اور مسلمانوں کو منصب قیادت سے ہمیشہ کے لئے محروم کرنے کی سازش کا ایک اہم حصہ تھا، لیکن یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں برابر جاری رہا، اورامت مسلمہ اس طرح کے فتنوں اورآزمائشوں سے ہمیشہ دوچار رہی، اور ہر زمانے میں اس صورت حال کا احساس علمائے دین اورداعیان اسلام پر چھایا رہا، اوراس کے نتیجہ میں امت کی اصلاح وتربیت اوراس کواپنے منصب پر واپس لانے کے لئے مخلصانہ جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا، اور جب بھی مخالفین کی طرف سے امت کوفرداً یا جماعۃً اپنے منصب سے محروم کرنے کے لئے نہایت سنجیدگی اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کوششیں شروع ہوئیں تو داعیان اسلام کے دلوں میں امت کے تعلق سے بے چینی لاحق ہوئی، اورانھوں نے مسلمانوں کوموجودہ فتنوں اور آنے والی آزمائشوں سے آگاہ کرنے کی ہر ممکن کوشش صرف کی، اوران کواپنے حقیقی منصب کی طرف لوٹنے کی تلقین کر کے اپنی ذمہ داری کوصحیح طریقے سے انجام دینے کا ثبوت پیش کیا، اللہ تعالیٰ اپنے ان مؤمن بندوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿ إنما المؤمنون الذين آمنوا بالله ورسوله، ثم لم يرتابوا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله أولئك هم الصادقون﴾ (سورہ) حجرات/۱۵)

”ایمان والے وہ لوگ ہیں جوایمان لائے اللہ پراوراس کے رسول پر پھر شبہ نہ لائے اورلڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اوراپنی جان سے، وہ لوگ جو ہیں وہی ہیں سچے۔“

۱۱رستمبر کوامریکہ میں پیش آنے والے واقعہ نے ثابت کردیا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کا انداز اب بدل گیا ہے اوراس کے لئے نہایت باریک بینی

اور ہوشیاری کے ساتھ منصوبہ بندی کی جاتی ہے، اور یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش ہے کہ اسلام ایک دہشت گردانہ مذہب ہے، اور مسلمان اس دہشت گردی کے علم بردار ہیں، لہذا ایسے مذہب کو اور اس کے ماننے والوں کو اس ترقی یافتہ، علم جدید اور ٹکنالوجی کے دور میں باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ الزام بھی اپنی اہمیت کو کھو چکا اور اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے مغربی ممالک کے لوگوں کا رجحان بہت زیادہ بڑھا، اور قرآن کریم کو براہ راست پڑھ کر ان کے دلوں میں اسلام قبول کرنے کا جذبہ بیدار ہوا، اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا، جب کہ یہ سارا مخالفانہ عمل اسلام سے متنفر کرنے اور اس کے متبعین کو برگشتہ کرنے کے لئے کیا گیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمہ کو بلند رکھا، اور آج صورت حال یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔

اسی کے ساتھ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہئے کہ آج امت مسلمہ کے افراد میں صحیح اسلامی روح کی بڑی کمی ہے، اسلامی زندگی میں انحطاط اور اخلاقی زوال کا تناسب بہت زیادہ بڑھ چکا ہے، اس لئے ہمارے مذہبی تشخص کا نمونہ لوگوں تک پہونچنے میں دشواری پیش آرہی ہے اور ہم اپنی وہ شان امتیازی دنیا کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہیں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے:

﴿ یاایھا الذین آمنوا إن تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا ویکفر عنکم سیئاتکم ویغفرلکم واللہ ذو الفضل العظیم﴾

(سورۂ انفال، آیت/۲۹)

”اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہوگے اللہ سے تو کردے گا تم میں شان امتیازی (دوسروں کے مقابلے میں) اور دور کردے گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش

دے گا، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید فرماتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ:

" والذی نفسی بیده،لتأمرون بالمعروف ولتنهون عن المنكر أو ليوشكن الله أن يبعث عليكم عقابا من عنده ثم تدعونه فلا يستجاب لكم"

" قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری انجام دیتے رہو گے، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تم پر کوئی عقاب (آزمائش) بھیج دے کہ پھر تمہاری دعائیں بھی قبول نہ کی جائیں۔"

ان حالات کا احساس کر کے مفکر اسلام حضرت العلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین، ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر عالی منزلت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نے مختلف مواقع پر مقالات تحریر فرمائے ہیں اور تقریریں کی ہیں ان میں موجودہ حالات میں مسلم معاشرہ کے عوام و خواص کے لئے زبردست پیغام ہے، اور بھرپور ذہنی فائدہ ہے اور منکر سے پرہیز اور معروف کی طرف دعوت دینے کا شعور بیدار کرنے اور منصب ہدایت پر واپس جانے کے لئے بیش قیمت مواد موجود ہے، اس ضرورت کے پیش نظر ان تقریروں اور مقالات کو ایک کتاب کی شکل میں پیش کرنے کی سعادت مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کو حاصل ہو رہی ہے، یہ کتاب انشاء اللہ تعالیٰ ہر اعتبار سے مفید اور فکر انگیز ہوگی اور نفع عام کا ذریعہ بنے گی۔ وللہ الأمر من قبل و من بعد

راقم الحروف

سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مدیر البعث الاسلامی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۶؍شوال ۱۴۲۵ھ

۳۰؍نومبر ۲۰۰۴ء

لائق توجہ امور
حالات حاضرہ کے پس منظر میں

تم ہی سر بلند ہو اگر ایمان والے ہو

قوموں کی زندگی میں لوگوں کے پیش نظر علی العموم تین مقاصد حصول راحت، حصول عزت اور حصول غلبہ قابل فکر و توجہ رہتے ہیں، اور ان تینوں کا بڑی حد تک ایک دوسرے سے تعلق ہے، اور ایک کے لئے کوشش دوسرے مقصد تک اور دوسرے کے لئے کوشش تیسرے مقصد تک لے جاتی ہے۔

پہلے راحت کی طلب ہوتی ہے، اور قوم کے افراد اس کے لئے فکر و جد و جہد کرتے ہیں، اور امتیازی صلاحیتوں کے افراد اس کی طلب میں اپنی کارگزاریوں سے راحت کے ذرائع قابل ذکر حد تک حاصل کر لیتے ہیں، لیکن اس مقصد کے تحت عموماً ایسے طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں جو اعلیٰ انسانی اقدار کے منافی ہوتے ہیں، اور ان سے قوموں کی اخلاقی حیثیت پسندیدہ قرار نہیں دی جاتی۔ موجودہ مغربی تمدن جس نے اپنی سائنسی ترقیات کے ذریعہ راحت کے وسائل بڑی مقدار میں حاصل کر لئے ہیں، اور ان کے ذریعہ ایک طرح کی عزت اور غلبہ بھی حاصل کر لیا ہے۔ اور اس کے ذریعہ اپنے مادی عروج کی ایک مثال قائم کی ہے اور وسائل حصول راحت کا ایسا نمونہ پیش کیا ہے جس کی نقل میں دنیا کی دیگر قوموں کو اپنی بڑی کامیابی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وسائل راحت کے اس حصول میں کتنی خود غرضی، کتنی حق تلفی اور کتنی زیادتی کا ارتکاب کرنا پڑا ہے اور یہ ارتکاب ظلم برابر جاری ہے۔ راحت کے حصول کے لئے

ذرائع راحت کی ضرورت ہوتی ہے، یہ انفرادی سطح پر کسی حد تک محدود طریقہ سے اور اجتماعی اور قومی سطح پر وسیع اور بین الاقوامی دائرہ میں ہوتی ہے۔ اور وسیع اور عالمی دائرہ میں دیکھا جائے تو اس وقت پٹرول اور اہم معدنیات کو خصوصی ذرائع کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، چنانچہ متمدن دنیا کی قائدانہ مقام رکھنے والی قومیں ان ذرائع پر قابو حاصل کرنے کے لئے ہر صحیح وغلط کام کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس کے سلسلہ میں دوسری قوموں کو اپنے زیر اثر لینا اور دوسروں کے ذرائع قوت و دولت پر قبضہ جمانے کی کوشش کرنا اور دوسروں کو اپنا مطیع وفرماں بردار بنانا ان کی ترقی وتمدن کا خاص وطیرہ بن گیا ہے۔ گذشتہ دوصدیوں کے دوران یورپ کی مشرق پر یلغار فوجی حکمت عملی اور ترقی یافتہ وسائل حرب کے ذریعہ ہوئی تھی، پھر جب جمہوریت کا انقلاب یورپ میں آیا اور اس کی بازگشت مشرقی ممالک میں بھی ہوئی تو یورپ نے اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی کی اور مشرقی ممالک سے اپنا بدنام کنندہ غلبہ بتدریج ہٹایا لیکن مشرقی ممالک کے ذرائع دولت سے صرف نظر نہ کرسکا، اور اس کے لئے ملک گیری کے بدنام ذرائع کو چھوڑ کر سیاسی اور مالی ذرائع اختیار کئے۔ اور اس طرح دوست بن کر مشرقی ممالک کو اپنے دام فریب میں لے لیا۔ اس طرح آج ہمارا مشرق دوبارہ مغرب کا غلام بنتا جارہا ہے۔

اس میں سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے مشرقی ممالک کے حکام و دانشور افراد جس طرح سو دوسو سال قبل مغرب کی غاصبانہ طالع آزمائی کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے اور اس کی روک تھام کا بروقت انتظام نہ کرسکے اسی طرح آج بھی مغرب کی نئی یلغار کے اثر ونتیجہ کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے اور اس کے تدارک کا بروقت انتظام نہیں کرسکے ہیں۔

فلسطین میں اسرائیل وامریکہ کی موجودہ ظلم وسفاکیاں اچانک پیش آنے والے واقعات نہیں ہیں، ان کی جڑیں اس وقت قائم ہوگئی تھیں جب وہاں کی اراضی کو

بتدریج خریدا جارہا تھا، اور وہاں کے عوام اس معاملہ کو انفرادی اور محدود سطح کا اقتصادی معاملہ سمجھ رہے تھے، اور حکومتیں اس کو کوئی خاص اہمیت کا معاملہ نہیں سمجھ رہی تھیں، اور جب ملک کے بعض علاقوں پر جائداد کی سطح کی ملکیت قائم ہونے پر حکومتی اختیار حاصل کرنے کی ابتدائی کوشش سامنے آئی اور جنگ ہوئی تو اس کو یورپ کے شاطروں نے پُرفریب وعدوں کے ذریعہ ان ہی کی حکومتوں کے توسط سے بند کرادیا، اور اسرائیل کے نام سے توسیع پسند انتظامیہ قائم کرکے ایک سامراجی حکومت قائم کرادی اور یورپ وامریکہ کی طرف سے اس کی پشت پناہی قائم وجاری ہوگئی۔

یورپ صلیبی جنگوں کی یاد میں امت مسلمہ کو اپنا اصل حریف سمجھتا رہا ہے، لہذا اس کو اپنے حریف کے علاقہ میں اپنی ایک مضبوط چوکی اور مسلح سپاہی چاہئے تھا جو اس نے اسرائیل کی صورت میں وہاں بٹھادیا۔ اور اب دوسرے مرحلہ میں مغربی حکمرانوں کو اپنے اس حریف کے معدنی واقتصادی ذرائع پر اپنا پورا اختیار قائم کرنا ہے جس کے لئے ہر وہ ذریعہ اختیار کرنا اس کے نزدیک صحیح ہے جو اس کے اس مقصد میں معاون ہو۔ حکومتوں کو بے بس کرنا، وہاں کے دانشوروں کی دانش کو اپنا ہمنوا بنانا جس کے لئے تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو پوری حکمت عملی کے ساتھ مقصد کے حصول کا کارگر ذریعہ بنادیا ہے۔

اور اب یہ بات اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ معمولی سطح کا پڑھا لکھا شخص بھی کسی نہ کسی حد تک مغرب کی طرف سے اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی حکمت عملی کو جان گیا ہے۔ لیکن یہ جاننا اب خاصا بعد از وقت ہے، لیکن نتیجۃً اس کے تدارک کے لئے جانی ومالی قربانیوں کا سلسلہ قائم ہوگیا ہے جو نہ معلوم کس حد تک جائے اور کیا کیا نتیجہ دکھائے؟۔

یہ ساری صورت حال دراصل قومی وملی عزت وآزادی اور قوم وملک کے تقاضوں کی طرف سے بے توجہی اور حالات کے مستقبل کا بروقت صحیح اندازہ نہ لگانے کے سبب پیش آئی، اور ملی شعور اور مستقبل کی توقعات وامکانات پر غور کرنے کا اب جو

رجحان پیدا ہوا ہے یہ اگر یورپ کی سامراجی تگ ودو کے آغاز پر ہوا ہوتا تو آج نقشہ ہی دوسرا ہوتا، لیکن جو ہوا سو ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے قومی شعور کی بیداری اور مستقبل کی حکمت عملی پر غور کس حد تک چست اور اثر انگیز ہے اور اس کے لئے ہمارے دانشوروں کا طرز عمل کیسا ہے؟۔

ہمارے مشرقی ممالک کے سماج کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے افراد ملت کے بنیادی اور اصولی معاملات میں بھی وحدت وتعاون مشکل سے اختیار کرتے ہیں، اور انفرادی اور شخصی راحت کے ذرائع کے حصول سے آگے غور کرنے کی عادت بھی ان میں کم ہی پائی جاتی ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مشرقی ملکوں کے کچھ افراد کو وقتی تگ ودو کے ذریعہ یا مغربی طاقت کی خوشامدوں کے ذریعہ انفرادی راحت کے سامان تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن قومی اور ملی سطح پر نقصان پہونچتا ہے۔

ضرورت ہے کہ ملت کے دانشور عام پڑھے لکھے لوگوں کو مستقبل کے خطرات سے آگاہ کریں اور موجودہ ملی وقومی سطح پر ہونے والی آفات سے بچنے کے طریقوں سے واقف کرائیں، اور ملت کا شعور اس طرح بیدار کرنے کی کوشش کریں کہ ملت اپنے دوست دشمن کو سمجھ سکے۔ اور اس پر اس کے رب کی طرف سے اسلامی فکر وعمل کا صحیح سہارا لیتے ہوئے جس حسن کردار اور عزیمت واولوالعزمی کی ذمہ داری ہے اس کو اختیار کرے۔ ایسا کرنے سے اس کو اس کی عہد ماضی کی عزت اور پھر غلبہ حاصل ہو سکے گا۔

اور قرآن مجید کا اعلان ہے کہ ﴿ و أنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين ﴾ (تم ہی سر بلند ہو اگر ایمان والے ہو) ایمان والے بننے کے لئے رب العالمین کے وعدوں پر یقین اور اسلام کے بتائے ہوئے عقیدہ وعمل اور عزیمت اور اولوالعزمی کے طریقوں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ آج امت اسلامیہ اس بات کی بڑی محتاج ہے۔

موجودہ عالمی حالات اور ہماری ذمہ داریاں [1]

آج دنیا میں مسلمانوں کو بہت سے مسائل درپیش ہیں اور ان کے حل کی کوششیں جاری ہیں، قدرتی طور پر ذہن میں تقاضے پیدا ہوتے ہیں کہ مسائل کو حل کرنے کے لئے جو مناسب تدابیر ہیں وہ کیسے اختیار کی جائیں، اور کس طریقہ سے یہ امت صحیح امت بنے؟، اس امت سے اللہ تعالیٰ نے خصوصی کام متعلق فرمایا، اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندہ کو یا بندوں کی کسی جماعت کو کوئی اعزاز عطا فرماتا ہے تو فضول اور یوں ہی بغیر کسی وجہ کے عطا نہیں فرماتا، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کی کچھ بنیاد اختیار فرماتا ہے، بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے زمانہ میں خیر امت قرار دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ہم نے سارے جہانوں پر ان کو فضیلت دی ہے، اور یہ کہ ہم نے جان بوجھ کر ان کو فضیلت دی ہے، فرمایا:

﴿ولقد آتينا بني إسرائيل الكتاب والحكم والنبوة، ورزقناهم من الطيبات، وفضلناهم على العالمين﴾ (سورہ جاثیہ:۱۶)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی، اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں، اور ہم نے ان کو دنیا جہاں والوں پر فوقیت دی۔''

اور فرمایا: ﴿ولقد اخترناهم على علم على العالمين﴾ (سورہ دخان:۳۲)

---

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی میموریل سنٹر حیدرآباد میں دانشور طبقہ کے سامنے کی گئی تقریر۔

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے علم کی رَو سے (بعض امور میں) تمام دنیا جہاں والوں پر فوقیت دی۔"

یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم نے کسی خوش فہمی یا شخصی حسن ظن میں ان کو فضیلت دیدی چونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ بہت راضی ہیں تو اس بنیاد پر بطور انعام کے اللہ نے ان کو یہ فضیلت دیدی، تو ایسی بات نہیں ہے بلکہ فرمایا: ﴿علیٰ علم﴾ جان بوجھ کر یہ کیا، اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی: ﴿وفضّلناهم على العالمين﴾ کہ جان بوجھ کر تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی، تو یہ جان بوجھ کر فضیلت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی امت، کسی قوم، کسی جماعت حتیٰ کہ کسی فرد کو جو مقام عطا کیا جاتا ہے، اس کے پیچھے کوئی وجہ ہوتی ہے، وجہ کیا ہوتی ہے؟ وجہ وہ جو اللہ کو پسند آتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رضامندی کی ہوتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کے بہت نیک بندوں کی اولاد ہوتے ہیں اور نیک اولاد ہوتے ہیں، نافرمان اولاد نہیں ہوتے یا خود زبردستی نیکی والے ثابت ہوتے ہیں اس بات سے اللہ تعالیٰ خوش ہو کر مقبولیت اور عزت عطا فرماتا ہے، اور اس کو موقع عطا کرتا ہے کہ وہ جماعت اور وہ امت اپنے کو اس مقام کے لائق بنائے گی جو مقام اللہ کو پسند ہے۔

خیر امت اور امت وسط

اس امت محمدیہ (علیٰ صاحبها الصلاة والسلام) کو اللہ تعالیٰ نے خیر امت بنایا ہے، اور اس کی وضاحت فرمائی ہے: ﴿كنتم خير أمة أخرجت للناس، تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله﴾ (سورہ بقرہ: ۱۱۰)

"فرمایا کہ تم بہترین امت ہو، کیسے تم بہترین امت ہو؟ وہ اس طرح کہ تم نیکی کی

ہدایت کرتے ہو، نیکی کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہو، اور نیکی کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو، اور برائیوں سے لوگوں کو روکتے ہو اور منع کرتے ہو"۔

اور دوسری جگہ فرمایا کہ: ﴿وكذلك جعلناكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس، ويكون الرسول عليكم شهيداً﴾ (سورہ بقرہ: ۱۴۳) کہ ہم نے تم کو یہ خصوصیت دی کہ تم کو امت وسط بنایا اور اس لئے بنایا کہ تم ساری دنیا پر گواہ بنو، اور تم پر گواہی دینے والا تمہارا رسول ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں بتائیگا، جب نامۂ اعمال پیش ہوں گے، امتیں پیش ہوں گی، افراد پیش ہوں گے، اس وقت ان کی کارکردگی وہاں پیش ہوگی، اور ہر امت کی شہادت اس کا نبی دے گا، لیکن یہ امت دنیا کی ساری امتوں کی گواہی دیگی، اور اس امت کی گواہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیں گے، گواہی اور شہادت دینے کا مطلب کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ کس نے کیا کیا؟ کس نے اچھا کیا؟ کس نے برا کیا؟ کس نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق گذاری، اور کس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی نہیں گزاری؟ لیکن یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ جس کو گواہ بنایا جاتا ہے وہ پہلے خود ان اچھی خصلتوں کا حامل ہوتا ہے جن اچھی خصلتوں کے ہونے یا نہ ہونے کی اس کو گواہی دینی ہوتی ہے، ایک شخص نماز نہیں پڑھتا وہ نماز نہ پڑھنے والے کی گواہی کیسے دے سکتا ہے؟ پہلے تو اس کو اسی سے نمٹنا پڑے گا کہ تم خود کیوں نماز نہیں پڑھتے تھے؟ تم فلاں کے متعلق کہہ رہے ہو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا تھا، تم کب پڑھتے تھے؟ تم کس منھ سے کہہ رہے ہو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا تھا؟ تو گواہی تو وہی دے سکتا ہے جو خود کم از کم اس بات کا حامل ہو، اس بات پر عمل کرتا ہو، تبھی تو گواہی دے گا، ورنہ کیسے کہہ سکتا ہے؟ کس منھ سے کہہ سکتا ہے؟۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے یہ اہم اور عظیم مقام متعین کیا ہے، اسے اس مقام پر ہونا ہے کہ تم دوسری امتوں کی گواہی دو گے، ساری دنیا کی گواہی دو گے،

﴿الناس﴾ کا لفظ ہے، یعنی سارے انسانوں کی گواہی دینی ہے کہ پروردگار! ہمارے زمانہ میں فلاں فلاں قومیں حق پر عامل تھیں، احکام الٰہی کو ماننے والی تھیں، اور فلاں فلاں قوموں کی حق سے روگردانی تھی، اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ فلاں نے اچھا کیا، ہم گواہی دیتے ہیں کہ فلاں نے برا کیا، لیکن ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ امت دوسری امتوں کی اور دوسری قوموں کی کس منھ سے گواہی دیگی، وہ کیسے کہے گی کہ دوسرے لوگ دنیا میں تباہی مچا رہے تھے، اور بری خصلتوں میں مبتلا تھے، اور خراب زندگی اختیار کئے ہوئے تھے، یہ گواہی ہم کس بنیاد پر دے سکتے ہیں؟ مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ تمہارا یہ مقام ہے یعنی ہونا چاہیے، اب قیامت تک دنیا میں جو امتیں ہیں، جو قومیں ہیں، اور جو کچھ وہ کر رہی ہیں، اس کی گواہی مسلمانوں کو دینی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا، وہ شخص یا وہ افراد یا وہ جماعت کہ جو خود عامل نہیں ہے، وہ کس طرح اللہ کے سامنے، کس منھ سے یہ کہہ سکے گی کہ فلاں عمل نہیں کرتا تھا، اور فلاں صحیح کام نہیں کرتا تھا؟ ہم اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر دوسروں پر خوب تبصرہ کرتے ہیں، دوسری قوموں پر تبصرہ کرتے ہیں، لیکن اپنی مجلسوں میں کرتے ہیں جہاں کوئی ٹوکنے والا نہیں، اور کوئی ٹوک سکتا نہیں، ٹوکے تو لڑائی ہو جائے، لیکن ہم خود اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں کہ ہم دوسری قوموں پر جو اعتراضات کرتے ہیں کیا وہ اعتراضات ہم پر نہیں کئے جا سکتے؟ کیا وہ نقائص ہم میں نہیں ہیں؟ جب وہ نقائص ہم میں پائے جاتے ہیں تو ہم کس طرح ان پر اعتراضات کر سکتے ہیں؟ اپنی مجلسوں میں تو ہم خوب تنقید کر سکتے ہیں، خوب اعتراضات کر سکتے ہیں، لیکن جب قیامت میں اللہ تعالیٰ کہے گا کہ تم نے اس ذمہ داری کا کیا کیا، بتاؤ، اس وقت امت کے پاس کیا جواب ہوگا؟۔

گواہوں اور مجرموں میں زمین آسمان کا فرق ہے

اس امت کے لئے بڑی اہم بات اور بڑی احساس ذمہ داری کی بات ہے کہ اس کو دو نہایت بلند مقام عطا کئے گئے ہیں، ایک امت وسط کا اور دوسرا شاہد کا، امت وسط یعنی خیر امت جو سارے معاملات میں صحیح اور معتدل راستہ پر چلنے والی اور معیاری امت ہے، اور دوسرے یہ کہ گواہ اور شاہد امت فرمایا: ﴿لتكونوا شهداء على الناس﴾، اس امت کو یہ عظیم مقام اس لئے دیا گیا تا کہ وہ گواہی دینے کی ذمہ داری سنبھال سکے، جب ہم معتدل اور معیاری راستہ پر چلیں گے، تبھی ہم دوسرے کی گواہی دینے کے لائق قرار پائیں گے، اللہ تعالیٰ نے یہ مقام اس امت کو عطا فرمایا تا کہ قیامت کے روز گواہی دینے کا یہ فریضہ انجام دے سکے، اور ظاہر ہے کہ جس کو گواہ بنایا جارہا ہو اس کے لئے کتنے اعزاز کی بات ہے، ایک طرف مجرمین پکڑے جارہے ہیں، دوسری طرف ان کے لئے گواہ لائے جارہے ہیں، گواہوں اور مجرموں میں زمین آسمان کا فرق ہے، گواہ کا کیا اعزاز اور کیا مقام ہے اور مجرم کا کیا مقام ہے؟ یہ سب جانتے ہیں، لیکن یہ تب ہے جب اس معیار کو قائم کیا جائے جو اس کے لئے مطلوب ہے۔

بنی اسرائیل کی فضیلت وذلت

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بنی اسرائیل کو اللہ نے سارے لوگوں پر فضیلت دی تھی اور یہ فرمایا کہ حقیقت اور واقعیت کو جانتے ہوئے یہ فضیلت دی تھی، جس وقت اللہ نے ان کو یہ فضیلت دی اس وقت وہ نہایت معیاری امت تھی، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے اور ان کے راستہ پر تھے، اور ان میں وہ صفات تھیں جن صفات پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اعزاز عطاء فرمایا تھا، لیکن جب انہوں نے اس اعزاز کا خیال نہیں رکھا اور اس مقام کا خیال نہیں رکھا جس کی بنیاد پر انہیں فضیلت دی گئی، اور وہ معصیتیں

کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ اپنے انبیاء تک کو شہید کیا، اور دین پر عمل کرنے والوں کے ساتھ استہزاء کیا، اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو اور اس کی نشانیوں کو بگاڑ کر پیش کیا، توریت کے احکام کو بدل دیا، چھپا دیا، اور دین کو دنیاوی فوائد کے لئے فروخت کرنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے پہلے تو ان کو موقع دیا کہ اب سنبھل جاؤ، اب سدھر جاؤ، لیکن جب انہوں نے کسی طرح مان کر نہیں دیا تو پھر آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر چیز سے محروم کر دیا، عزت سے محروم کر دیا، اس عزت سے بھی جو انسانوں کے لئے اللہ نے رکھی ہے، جو کافر کو بھی ملتی ہے اور مسلم کو بھی ملتی ہے، ان کو کافروں والی عزت سے بھی محروم کر دیا اور فرمایا کہ ان کے لئے ذلت اور رسوائی ہے، ﴿وضربت علیهم الذلة والمسكنة﴾

(سورہ بقرہ:۶۱)

''اور ان پر جما دی گئی ذلت اور محتاجی۔''

اور اگر آپ تحقیق کریں اور معلومات کریں تو بات ایسی ہی ہے، بنی اسرائیل آج بھی رسوا اور ذلیل و خوار ہیں، ڈنڈے کے زور سے کوئی بھی غنڈا بڑا بن سکتا ہے، لیکن اس کو سب جانتے ہیں، اور دلوں میں اس کی جو حیثیت ہوتی ہے وہ بھی معلوم ہوتی ہے، طاقت کے زور سے یا اپنے مکر و فریب سے کسی کو دبا لیا جائے وہ الگ بات ہے، لیکن انسان کی عزت جو دلوں میں ہوتی ہے، اور اس کا احترام جو دلوں میں ہوتا ہے وہ اصل چیز ہے، اس وقت دنیا میں یہودیوں کی کوئی عزت نہیں ہے، ان کے دوستوں کے دلوں میں بھی ان کی عزت نہیں ہے، دشمنوں کے دلوں میں تو کیا ہوگی، لیکن لوگوں کے مصالح، ان کے فوائد اور ان کے بہت سے مسائل ان سے وابستہ ہیں اس لئے ظاہری طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ان کو ایک طاقت حاصل ہے، لیکن کوئی عزت ان کی نہیں ہے، اور ہو بھی کیسے سکتی ہے جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے لئے ذلت لکھ دی ہے۔

یہ بڑی عبرت کی بات ہے کہ جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب پر فضیلت دی تھی اور جان بوجھ کر فضیلت دی تھی ان کو اللہ تعالیٰ نے بعد میں رسوا بھی کر دیا، اور دنیا کو یہ دکھا دیا اور قرآن شریف کے ذریعہ سب کو بتا دیا کہ اگر باپ دادا اچھے عمل کرنے والے ہیں تو یہ کافی نہیں ہے، بلکہ انسان کو خود بھی عمل کرنا ہوگا، صرف یہ نسبت کافی نہیں ہے کہ ہم فلاں نبی کے ماننے والے ہیں، ہمارے باپ دادا ایسے تھے، ویسے تھے، پدرم سلطان بود، اس سے پورا کام نہیں چلتا، یہ بتاؤ کہ تم کیا ہو؟ تم اس معیار کو قائم رکھے ہوئے ہو یا نہیں جو معیار تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا؟ وہ یہ کہ تمہیں دوسروں کی رہنمائی کرنی ہے، دوسروں کو راہ حق پر لانے کی کوشش کرنی ہے، اور دوسروں کو غلط راستہ سے بچانے اور روکنے کی کوشش کرنی ہے، لیکن اس صورت میں کہ تم خود اس لائق بنو کہ دوسروں کو غلط راہ سے روکو، تم خود صحیح راستہ پر چلو، حق کی طرف تم دعوت دو گے تو پہلے تم خود اپنے کو حق پر قائم کرو، تب تم دوسروں کو حق کی دعوت دے سکتے ہو، تو اس امت کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو فریضہ عطا فرمایا ہے وہ فریضہ یہ ہے کہ اس کو دوسروں کی رہنمائی کرنی ہے، دوسروں کو حق کی طرف لانا ہے، اور لوگوں کو متوجہ کرنا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے یہ اخلاق متعین کئے ہیں، تمہارے لئے یہ زندگی متعین کی ہے، یعنی تمہیں امت ہدایت بننا ہے، اور اس کے بعد پھر نظر رکھنی ہے ساری قوموں پر، ساری ملتوں پر، جب دوسروں کو دعوت دی جائے گی، دوسروں میں گھس کر کام کیا جائے گا، دوسروں تک بات پہونچائی جائے گی تو ہم دوسروں کا حال بھی جان لیں گے کہ وہ کیسے ہیں؟ حق کی دعوت کو انہوں نے قبول کیا کہ نہیں قبول کیا؟ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کو کس نظر سے دیکھا؟ اور کس طرح ان کے ساتھ معاملہ کیا؟ اس سے ہم واقف ہو جائیں گے، ساری دنیا ہمارے سامنے واضح ہو جائے گی، اب ہم ہر امت کو پہنچان جائیں گے کہ اس کا کیا

حال ہے؟ اور وہ اپنے پروردگار کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے لئے تیار ہے یا تیار نہیں ہے؟ ہم یہ کہہ سکیں گے کہ پروردگار! ہم نے آپ کا پیغام ان تک پہونچایا تھا لیکن انہوں نے نہیں مانا، سنی ان سنی ایک کردی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے متعلق عظمت و عزت، پھر نالائقی اور ذلت کا واقعہ سنا کر یہ بتا دیا کہ تم کو عزت عطا کر رہے ہیں، لیکن وہ کیسے اور کس طرح؟ اور تم سے پہلے جو امت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے پسند کیا تھا اور معزز مقام عطا فرمایا تھا اس کا حال یہ ہوا کہ پھر پروردگار کو ناراض کر دینے پر پروردگار نے اسے راندۂ درگاہ بھی کر دیا، کیوں کیا؟ اس لئے کہ وہ اپنے راستہ سے ہٹ گئے، اور انہوں نے اپنے فریضہ کو انجام دینا چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں آگے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو رسوا کیا۔

جب ہم اس امت کی اور مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ دونوں باتیں ملتی ہیں، چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قیامت تک کے لئے اس کو خیر امت بنایا ہے، اس لئے پوری امت فنا ہونے سے محفوظ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی، اللہ نے دعا قبول فرمائی، آپؐ نے یہ دعا فرمائی تھی کہ یہ امت ہر حال میں اچھی رہے، تو یہ تو نہیں قبول ہوئی، البتہ یہ دعا قبول ہوئی کہ پوری کی پوری امت مصیبت میں مبتلا نہیں ہوگی، تباہ نہیں ہوگی، امت تو قیامت تک رہے گی، کیونکہ کچھ لوگ، کوئی نہ کوئی گروہ، کوئی نہ کوئی طبقہ، حق کے راستہ پر قائم رہے گا، لیکن جو حق کے راستہ پر قائم نہیں رہے گا اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے گا جو اس سے پہلے کی امتوں کے ساتھ پیش آیا، اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی تفصیل سے ہے، اور ہمیں تاریخ میں بھی اس کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔

ہندوستان کی غلامی کا واقعہ

آپ تاریخ کا مطالعہ کریں، اندلس کا واقعہ آپ کے سامنے ہے، بغداد کی

تباہی کا واقعہ آپ کے سامنے ہے، آپ بہت آگے نہ جایئے، صرف ہندوستان کی غلامی کا جو واقعہ ہے اس کو دیکھئے کہ یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی، پورا ہندوستان ان کے پاس تھا، لیکن کس طرح ان سے مغربی طاقتوں نے یہ ملک چھینا، اور ان سے لے لیا، اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں، ہم سیاسی حالات پر نظر ڈال کر اس کے اسباب تلاش کرتے ہیں، لیکن اس کے جو معنوی اسباب ہیں ہمیں ان کو بھی دیکھنا چاہئے، جس وقت انگریز اس ملک میں آکر قابض ہوئے ہیں اس وقت یہاں کے مسلمانوں کی حالت انتہائی خراب تھی، کوئی بھی خرابی اور جرم ایسا نہیں تھا جو مسلمانوں میں نہ پایا جاتا ہو، ان کی سوسائٹی بہت کرپٹ ہو چکی تھی، ان کے حالات انتہائی ناپسندیدہ ہو چکے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے میں تازیانہ ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحریروں کو دیکھئے جن میں انہوں نے مسلمانوں کو سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس وقت مسلمانوں کی سوسائٹی کتنی خراب ہو چکی تھی، نتیجہ کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے ملک کی قیادت ان سے چھین کر غیروں کو دیدی، باہر سے آنے والوں کو دیدی، اسی طرح کی بات بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آئی کہ جب جب ان کی نافرمانیاں بڑھیں تب تب ملک ان سے چھینا گیا اور دوسری قوموں کے ذریعہ ان کو سزا دی گئی، اور ان کو بیت المقدس سے اس طرح نکالا اور تباہ کیا گیا جیسے ناپسندیدہ جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی سے ملتا جلتا واقعہ ہندوستان میں پیش آیا، اللہ تعالیٰ نے یہ ملک مسلمانوں کو دیا تھا، اس ملک کو انہوں نے صحیح استعمال نہیں کیا، اور جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے بالکل خلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے ملک چھین لیا، اللہ تعالیٰ کی کسی سے رشتہ داری نہیں ہے، قرابت داری نہیں ہے کہ ہر حال میں رعایت کی جائے، جس سے رشتہ داری ہوتی ہے اس کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ بیٹا بیٹا ہے چاہے لائق ہو یا نالائق ہو، اللہ تعالیٰ کی کسی سے ایسی کوئی قرابت داری نہیں

ہے، اللہ نے صاف فرما دیا کہ تم صحیح کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو نوازے گا، اور غلط راستہ پر چلو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے گا، یہاں رعایت نہیں ہے، تو ہمیں اس حیثیت سے اپنا جائزہ لینا چاہئے، اپنی سوسائٹی کا بھی جائزہ لینا چاہئے، اور اپنا ذاتی جائزہ بھی لینا چاہئے، کیونکہ قوم دو طرح کے اعمال سے بنتی ہے، ایک انفرادی اعمال سے اور دوسرے اجتماعی وسماجی اعمال سے، ایک یہ کہ ہم اندر سے خود کیا ہیں؟ اللہ کا ہمارے اندر کتنا خوف ہے؟ ہم اللہ کے حکموں پر کتنا عمل کرتے ہیں؟ فرائض کو ہم کتنا انجام دیتے ہیں؟ ہم میں تقوی کتنا ہے؟ ہم اپنی انفرادی عبادت کتنی انجام دیتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق کتنا ہے؟ یہ سب انفرادی باتیں ہیں۔

اور دوسری اجتماعی باتیں ہیں، وہ یہ کہ ہمیں آپس کی زندگی میں اجتماعی کاموں میں جو حسن خوبی اور اپنے پروردگار کے احکام کی بجا آوری جو انجام دینی چاہئے، وہ ہم کتنا انجام دیتے ہیں؟ یعنی حق کی طرف رہنمائی کرنا، دین پر صحیح طور پر عمل کی دعوت دینا، اور لوگوں کو درست کرنے کی کوشش کرنا، اور یہ کہ ہماری سوسائٹی اور ہمارا معاشرہ بھی معیاری معاشرہ ہو، اس میں اچھا ماحول بنے، اچھی عادتیں اختیار کی جائیں، اور ایک دوسرے کی اصلاح کی اور ایک دوسرے کو غلط راستہ سے بچانے کی فکر ہو، اور یہ کام مقامی سطح پر بھی اور عالمی پیمانہ پر کرنا ہے، یہ وہ عظیم کام ہے جس کے کرنے پر اس امت کو سارے انسانوں پر فوقیت دی گئی ہے، سارے انسانوں کے ساتھ اس کو اسی طرح کی خیر خواہی اور خیر پسندی کا رویہ اختیار کرنا پڑے گا، اور اس کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے تو آدمی اپنی ذات سے شروع کرے، پھر اپنے ماحول اور اپنی سوسائٹی سے شروع کرے، اور پھر پوری دنیا میں اپنے کام کو پھیلائے، اور چونکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ یہ امت پوری کی پوری ہلاک نہیں ہوگی، اس لئے آپ دیکھیں گے کہ اس معیار کو امت کے کچھ نہ کچھ افراد بحال کئے

ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے امت ٹھہری ہوئی ہے، اگر کبھی اس راستہ سے ہٹ جائیں، جیسے بنی اسرائیل کی اکثریت اس راستہ سے ہٹ گئی تھی تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوتی ہے۔

بغداد اور اندلس کی تباہی

بغداد کی تباہی کا واقعہ معمولی واقعہ نہیں ہے، ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں، میں نے مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت بغداد میں رسم ورواج، اسراف اور من مانی زندگی عام ہوگئی تھی، اس کی ایک بات بطور مثال کے یہ ہے وہ عید اور بقرعید کی نماز پڑھنے جاتے تو ایک جلوس کی شکل میں جاتے، جو بڑا زبردست ہوتا، اس میں خلیفہ اور بادشاہ ہوتے، حکومت کے آفیسرس ہوتے، فوج کے سارے لوگ اسلحہ کے مظاہرہ کے ساتھ ہوتے، اور اس کے جواز میں ان کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ دوسری قوموں کے افراد اور کفار ومشرکین بھی ہیں اس لئے ہم انہیں شوکت اسلام دکھانا چاہتے ہیں کہ دیکھو یہاں مسلمانوں کی حکومت کتنی مضبوط ہے، مسلمان کتنے پُرشوکت وعظمت ہیں؟ اس کے لئے سارے اسلحے اور لاؤ لشکر سمیت جیسے کہ ہمارے ملک میں یوم جمہوریہ منایا جاتا ہے اس طرح ہوتا تھا، عید وبقرعید کے موقع پر جلوس نکلتا تھا، اس میں شہر کے اور ارکان سلطنت کے بڑے اور اہم لوگ اور عوام سب شریک ہوتے تھے، ایک بڑا مجمع ہوتا تھا، اور یہ شان وشوکت چلتی تھی، ظاہر ہے کہ جب اتنا بڑا جلوس چلے گا اور اس قدر شان وشوکت کا مظاہرہ ہوگا، تو لکھا ہے کہ بعض مرتبہ عیدگاہ تک پہونچتے پہونچتے مغرب ہو گئی اور عید کی نماز مغرب کے بعد ہوئی، بیچ کی نمازوں کا کیا ہوگا؟ کیسے ادا ہو سکی ہوں گی؟ اندازہ لگا سکتے ہیں، شان وشوکت، دکھاوے اور رسمیات میں بتدریج اس حال تک پہونچ گئے تھے، اور اسراف اور دنیاداری آہستہ آہستہ بڑھ گئی تھی، پھر اللہ تعالیٰ

نے انہیں سزا دی، بنی اسرائیل کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا اور یہی مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوا۔

اس حال میں کافر تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا ہے، اور تین روز تک لوگوں کو اس طرح قتل کیا کہ دجلہ کا پانی خون سے سرخ ہوگیا، اور کتب خانوں کو اس طرح جلایا اور دریا میں پھینکا کہ ان کی روشنائی سے دریا کا پانی کالا ہوگیا، اور لاکھوں آدمیوں کو ذبح کر کے رکھ دیا اور حکومت ختم ہوگئی، یہ کس کے ساتھ ہوا؟ مسلمانوں کے ساتھ ہوا، جو خیر امت ہیں، تو خیر امت ہونا کوئی تمغہ اور انعام نہیں ہے، یہ ذمہ داری ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ ہے کہ جب ذمہ داری نبھاؤ گے تو انعام پاؤ گے، اور نہیں نبھاؤ گے تو بھگتو گے، یہ کام نہیں آئے گا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں، اور یہ کہ ہم خیر امت ہیں، یہ کام نہیں آئے گا، بلکہ اپنے کو ثابت کرنا ہوگا، اپنی سیرت ایسی بنانی ہوگی، ورنہ تباہی آئے گی، خواہ کافروں کے ہاتھوں سے آئے، اور ہم جب تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے واقعات جگہ جگہ پیش آئے کہ جب مسلمانوں نے اپنا معاشرہ خراب کرلیا، اور ان میں برائیاں عام ہوگئیں، اللہ کا خوف ختم ہوگیا، شریعت کی پابندی ختم ہوگئی، تو اللہ نے کسی کو کھڑا کر دیا، اس نے پٹائی کی، اور ایسی پٹائی کی کہ دیکھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔

تاتاریوں کا قبول اسلام

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ اس کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجا ہوا دین قیامت تک باقی رہے گا، اور اس کی امت باقی رہے گی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں قاتل وکافر تاتاریوں کو اسلام اختیار کرنے کی توفیق دیدی، اور ایسا مسلمان بنا دیا کہ پھر اس امت کی قیادت ان ہی کے ہاتھ میں آگئی، یہ

عثمانی خلافت کیا ہے؟ یہی تاتاری لوگ تھے، اس نے صدیوں اسلام کی قوت وعظمت کا مظاہرہ کیا، ان کے سامنے کافر یورپ تھا، انہوں نے یورپ کو ایسا دبایا جیسے کسی کمزور دشمن کو دبایا جاتا ہے، ترکی کی اسلامی طاقت کے اثرات پورے یورپ پر پڑے تھے، یورپ ان کے سامنے لرزتا تھا، اور یہ حال تھا کہ بعض مرتبہ ترکی شہزادہ کسی یورپ کے ملک میں چلا جاتا تھا تو وہاں یہ آرڈر ہو جاتا تھا کہ آج گرجوں کی گھنٹیاں نہ بجیں، اس لئے کہ ترکی شہزادہ آج شہر میں آیا ہوا ہے، اس کو تکلیف ہوگی، یہ یورپ کا حال تھا، یہی یورپ جس کا آج دنیا میں غلغلہ ہے، یہ ترک کون لوگ ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے جب کہ کافر تھے لیکن مسلمانوں میں اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کرنے اور اپنی ذمہ داری انجام دینے میں کوتاہی زیادہ ہوگئی تھی تو بغداد میں مسلمانوں کو اس طرح ذبح کیا تھا کہ تاریخ کا دردناک واقعہ بن گیا، اس امت کو ذلیل کر کے رکھ دیا تھا، لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ان ہی کو مسلمان بنادیا، اور مسلمانوں کی قیادت انہی کو دیدی، اللہ تعالیٰ کے لئے کیا مشکل ہے، اور انہوں نے پھر صدیوں تک اسلام کی عظمت قائم رکھی، دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور رہی تھے، اور اپنی اسلامیت کے ساتھ تھے۔

ترکی خلیفہ کے پاس یہودی نمائندہ گیا، اور اس نے کہا کہ آپ کا جو قرض ہے (ترکی خلافت آخر میں بہت مقروض ہوگئی تھی، اور اسی قرض کی وجہ سے اس کو ختم ہونا پڑا) ہم آپ کا سارا قرض ادا کریں گے، بس آپ ہم کو فلسطین (بیت المقدس) میں جگہ دیدیں، ترکی خلیفہ کے ایمان کی بات ہے کہ یہ سنتے ہی ان کو دینی غیرت اتنی ہوئی کہ غصہ آگیا، کہا کہ بیت المقدس تم کو دیدیں؟ کہا اس کتے کو یہاں کون لایا ہے؟ نکالو اس کتے کو یہاں سے، اس کو وہاں سے نکلوادیا، کہا کہ ہم فلسطین کی زمین کا ایک انچ بھی نہیں چھوڑ سکتے، یہ ہماری عزت اور دین کی علامت ہے، یہ تھی ایمان کی بات، اللہ تعالیٰ نے ان کی اسلامیت پر ہی ان کی مدد کی، صدیوں وہ دنیا پر غالب رہے اور

سب سے زیادہ طاقتور رہے، لیکن سب اعمال پر ہوتا ہے، زندگی کو اللہ کی رضا کے مطابق بنانے سے ہوتا ہے، اب ان کی وہ حالت نہیں، اور اب ان کی وہ حقیقت بھی نہیں، آج ہم اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں تو کتنی خرابیاں ہیں جو ہم میں عام ہیں؟ اور ان کو درست کرنے کی کوئی فکر نہیں کرتا، ہمیں اپنے کو بھی درست کرنا ہے اور پھر اپنی سوسائٹی کو بھی درست کرنا ہے، تنہا اپنے کو درست کرنا کافی نہیں ہے، پہلے تو آدمی اپنے کو درست کرے، پھر سوسائٹی کو درست کرے، پھر آگے بڑھے اور دوسروں کی سوسائٹی کو درست کرنے کی فکر کرے، کم سے کم پیغام پہونچا دے، اپنا فرض انجام دیدے، اپنی ذمہ داری پوری کردے، اگر اس سے کسی کو ہدایت نہیں ملتی اور اللہ کے یہاں اس کی ہدایت نہیں لکھی تو ہم صرف کوشش کر سکتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے کہا کہ تم ہدایت نہیں دے سکتے، ہم جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، فرمایا: ﴿إنك لا تهدي من أحببت، ولكن الله يهدي من يشاء﴾ (سورہ القصص: ۵۶) تمہارا کام صرف پیغام پہونچانا ہے، اور تمہیں حق کی بات کا پہونچانا ہے، یہی کام مسلمان کے سپرد کیا گیا کہ اپنے کو درست کرے، اپنی سوسائٹی کو درست کرے، پھر دوسروں کی سوسائٹی تک اللہ کا پیغام پہونچائے، دوسروں کو درست کرنے کی کوشش کرے تو اللہ کا وعدہ نصرت کا ہے، اور بلند مقام عطا کرنے کا ہے، تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، جب مسلمانوں نے اس پر عمل کیا تو اللہ نے ان کو بلندی عطا فرمائی، عظمت عطا فرمائی، اس کی ایک مثال نہیں متعدد مثالیں ہیں، یہ اصول قیامت تک چلے گا، جس کو بھی باعزت بننا ہے، عزت حاصل کرنی ہے، اور جس کو بھی مقام حاصل کرنا ہے، اس کو اس پر عمل کرنا ہوگا، جو اللہ نے اس کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ طریقہ بتایا ہے، اور جو اس میں کوتاہی کرے گا تو ظاہر ہے کہ کڑوا پھل کڑوا مزہ دے گا، میٹھا پھل میٹھا مزہ دے گا، اور پھر وہ حالات پیش آتے ہیں جن حالات میں آدمی کو افسوس ہوتا ہے۔

اس وقت جو بھی دین کی خدمت ہورہی ہے، جو بھی کام ایسا ہورہا ہے جو اللہ کو پسند ہے، یہ اس کی برکت ہے کہ امت ٹھہری ہوئی ہے، اور اس امت کو مصائب اس طرح نہیں پیش آرہے ہیں جس طرح پیش آنے کا خطرہ ہوسکتا ہے، لیکن جہاں غفلت ہوگی اور جہاں حالات زیادہ خراب ہوں گے وہاں پھر وہ حالات بھی خراب ہوجائیں گے جو دنیاوی حالات کہلاتے ہیں، دنیاوی حالات دینی حالات کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، دینی حالات جب درست ہوتے ہیں تو دنیوی حالات بھی درست ہوتے ہیں، اس کو اس طرح سمجھئے کہ اگر درخت کی جڑیں صحیح ہیں تو درخت پھولے گا، پھلے گا، اور اس میں اچھا پھل آئے گا، اور اگر جڑوں میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے تو اوپر پھل بھی خراب ہوگا، ہم صرف اوپر کو دیکھتے ہیں، نیچے کو نہیں دیکھتے، ہم باہر کو دیکھتے ہیں، اندر کو نہیں دیکھتے، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم کو عزت حاصل نہیں، ہم کو وہ حیثیت حاصل نہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے اعمال کیسے ہیں؟ ہماری سیرت کیسی ہے؟ ہمارے اخلاق کیسے ہیں؟ ہمارا معاشرہ کیسا ہے؟ ہم میں کتنی وہ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے صرف خلاف ہی نہیں ہیں، بلکہ اللہ کو ناراض کرنے والی ہیں۔

مسلمانوں کے حالات کا بہتر ہونا دین کے تحفظ میں ہے

اس وقت جو صورت حال مسلمانوں کی ہے اس کو بہتر بنانے کے لئے، اور اپنے تحفظ کے لئے ہم کو دین کے تحفظ کی فکر کرنی ہے، ہم جتنا دین کا اور ان تعلیمات کا تحفظ کریں گے جو ہم کو دی گئی ہیں اتنا ہی اس دنیا میں بھی ہمارا تحفظ ہوگا، اور ہم کو وہ عزت حاصل ہوگی جس عزت کے ہم طالب ہیں اور یہ صرف وعظ نہیں ہے بلکہ ایک جائزہ ہے، مسلمانوں کی تاریخ کا اور بنی اسرائیل کی تاریخ کا، اس کی مثالیں قرآن مجید میں بھی ذکر کی گئی ہیں، اس جائزہ سے ہم کو فائدہ اٹھانا چاہئے، ہم کو یہ چاہئے کہ ہم اپنی

سوسائٹی کو درست کریں، اپنے اخلاق کو درست کریں، اور اس راستہ کو زیادہ سے زیادہ اختیار کرنے کی کوشش کریں جس راستہ سے ایک مسلمان کو عزت حاصل ہوتی ہے، اور مقام حاصل ہوتا ہے، ہم کافروں کو دیکھتے ہیں، دوسری قوموں کو دیکھتے ہیں کہ ان کو یہ اعزاز حاصل ہے تو بعض وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم تو اسلام پر عمل کرنے والے ہیں ہم اللہ اور اس کے رسول کو ماننے والے ہیں، ہم کو یہ مقام، یہ عزت حاصل نہیں، اور کافروں کو حاصل ہے، تو بھائی کافروں کو جو حاصل ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق صاف صاف یہ کہا ہے کہ اس کی اہمیت نہ سمجھو کہ کافروں کو عزت وشوکت حاصل ہے، ان کو دولت حاصل ہے، یہ صرف ان کی اسی دنیا کا فائدہ ہے، یہ صرف اسی حد تک ہے، جب تک ان کو موت نہیں آتی تب تک یہ فائدہ اٹھانے والے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو اس کی زندگی کے صرف چند سال کا فائدہ ہے پھر بعد میں پکڑ اور سزا ہی سزا ہے تو کیا فائدہ ہے؟ قیامت کے بعد جب یہ زندگی ختم ہوگی تو ان کو کچھ نہیں ملے گا، اس لئے ان پر رشک نہ کرو، رشک کرنے کی بات یہ ہے کہ دوسری زندگی میں جو آخرت کی زندگی ہے اس میں ہم کو کیا ملے گا؟ جو نہ ختم ہونے والی زندگی ہے جس کو سال اور دن کے لحاظ سے کوئی شمار نہیں کرسکتا، اس زندگی میں ہم کو کیا ملے گا؟ لیکن اللہ تعالیٰ یہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اگر ان کا حال درست ہو، تو اس زندگی میں بھی دیتا ہے اور اس زندگی میں بھرپور دیتا ہے، دنیاوی زندگی میں بقدر ضرورت دیتا ہے، اور اصل وہاں دیتا ہے جو آخرت مں ملنے والا ہے، اور کافروں کو تو یہ ہے کہ ان کو جو بھی ملتا ہے صرف اسی چند روزہ زندگی میں ملتا ہے، اور ایک جگہ تو اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ اگر اس کا خطرہ نہ ہوتا کہ مسلمان کافروں کی دولت دیکھ کر بہک جائیں گے تو ہم کافروں کو ایسے ایسے محل دیتے کہ وہ سونے چاندی کے محل ہوتے، اس کے زینے اور راستے سونے اور چاندی کے ہوتے، کہ مزہ اڑالیں، ﴿ولولا أن يكون الناس أمة واحدة لجعلنا لمن

يكفر بالرحمن لبيوتهم سقفاً من فضة ومعارج عليها يظهرون، ولبيوتهم أبواباً وسرراً عليها يتكئون وزخرفاً،وإن كل ذلك لما متاع الحياة الدنيا والآخرة عند ربك للمتقين﴾ (سورہ الزخرف:۳۳-۳۵)

''اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے ہوجاوینگے تو جولوگ خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں ہم ان کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کردیتے ہیں اور زینے بھی جن پر چڑھا کرتے اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی اور تخت بھی جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں، اور سونے کے بھی اور یہ سب کچھ بھی نہیں صرف دنیوی زندگی کی چندروزہ کامرانی ہے اور آخرت آپ کے پروردگار کے ہاں خداترسوں کے لئے''

ان کو کچھ زیادہ ملتا ہے تو ان کو صرف دنیا کے لئے محنت کرنے پر صرف دنیا تک کے لئے ملتا ہے یہ صرف چند برسوں کا مزہ ہے، اس سے زیادہ ان بیچاروں کو ملنا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کافروں کو اتنا نہیں دے رہے ہیں کہ اس کو دیکھ کر مسلمان بہک جائیں، ورنہ یہ چیزیں اصلاً مسلمانوں کو آخرت میں ملنے والی ہیں اگرچہ اس دنیا کے اندر بھی اللہ تعالیٰ ان کو راحت عطا فرمائے گا، ان کی ضرورت کے مطابق ان کو عطا فرمائے گا، لیکن یہ اس وقت ہے جب ہم اللہ کو راضی کرنے کی زندگی اختیار کریں گے، ورنہ پھر وہی معاملہ ہوگا جو دوسری قوموں کے ساتھ ہوا ہے۔

ہمیں اس کی فکر کرنی چاہئے اور ہمیں اپنے کو بھی درست کرنا چاہئے، اور اپنے معاشرہ کو بھی، اور یہ کہ ہم کو داعی بننا چاہئے تاکہ ہم اپنی ذمہ داری انجام دینے میں سرخ رو ہوں اور قیامت میں دوسری امتوں کے لئے گواہ بننے کے قابل بھی ہوسکیں۔

❖ ❖ ❖

ہندوستان میں سب ہم وطنوں کی آپس کی برابری کیسے ہو؟

انسان کی اجتماعیت خاندانی اجزاء سے بھی بنتی ہے اور کسی مقام پر اکٹھا بود وباش ہونے سے بھی بنتی ہے اور انسان کی اجتماعیت جس بنیاد پر ہو وہ اس کی زندگی کا بڑا حصہ ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے لئے قوت بھی حاصل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ زندگی کا معیار بھی بناتا ہے، اجتماعیت کے جہاں کچھ مشترک اثرات ہوتے ہیں وہاں کچھ مشترک تقاضے بھی ہوتے ہیں، جن کا خیال رکھنے سے اجتماعیت نہ صرف یہ کہ کار آمد ثابت ہوتی ہے بلکہ اس سے مفید نتائج اور خوشگوار حالات حاصل ہوتے ہیں، جمہوری نظام میں اس تقاضہ کا لحاظ کیا جاتا ہے، جمہوریت میں سب انسان برابر سمجھے جاتے ہیں، اسلام نے اس برابری کی تاکید ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع کے خطاب میں فرمایا تھا کہ تم سب آدم کی اولاد ہو، گورے کالے کا فرق نہیں، لہذا سب انسانوں کو اس میں برابر سمجھنے اور برابر سمجھ کر لحاظ کرنے کی تاکید فرمائی۔

قدیم زمانوں میں عام طور پر لوگ صرف خاندانی اجزاء پر مشتمل اجتماعیت سے رہتے تھے، اس صورت میں ان کی رہائشی یکجائی اور خاندانی یکجائی ایک ہوتی تھی، ان کے اجتماعی مسائل و معاملات بھی اسی یکجائی کی بنیاد پر ایک طرح کے ہوتے تھے،

اس طرح ان میں آپسی فرق نہ ہونے کی بنا پر آپسی اختلاف کم ہوتا تھا، بعد کے زمانہ میں جیسے جیسے تمدن وتہذیب کا غلبہ ہوا، انسان کی اجتماعیت کی شکلیں خاندانی شکل کے علاوہ بھی پیدا ہو گئیں، ایک انسان کی خاندانی ونسلی بنیاد پر اجتماعیت شروع انسانی دور میں زیادہ تھی، لیکن اس کا عمل دخل معاش کی ضرورتوں کی وجہ سے لوگوں کے ادھر ادھر مختلف علاقوں میں پھیل جانے کی وجہ سے کم سے کم تر ہوتا چلا گیا اور جہاں باقی رہا عموماً محدود سطح پر رہا، البتہ بودوباش اور کاروبار ودیگر تمدنی مقاصد کے تحت علاقائی بنیاد پر اجتماعیت کی صورت پیدا ہوئی، اس اجتماعیت میں، مختلف خاندان، مختلف طبقات، مختلف مذاہب کے لوگ خلط ملط ہو کر اکٹھا اور ساتھ رہتے ہیں، ایسی صورت میں آپس میں جو مختلف فرق پائے جاتے ہیں ان سے اختلاف اور کشمکش کے اسباب ابھر سکتے ہیں اور اثر انداز ہو سکتے ہیں، لہذا ایسی اجتماعیت میں اس بات کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایسے اجتماعی تعلق میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ دیگر اختلاف وفرق کے سبب سے آپسی تعلق کو نقصان نہ پہونچے، مختلف اجتماعی تقاضوں کا حق برقرار رکھتے ہوئے اس مشترک اجتماعیت کو قائم رکھا جائے، ایسی اجتماعیت کا حق ادا کرنے کے لئے جس میں مختلف مذاہب مختلف نسلیں اور مختلف ثقافتیں ہوں انسانیت کے عمومی تعلق کی بنیاد سب سے مؤثر بنیاد ہوتی ہے، اس میں افراد کے مفادات کو انسانی مفاد پر دیکھا جاتا ہے، اور اسی بنیاد پر پڑوسی پر پڑوسی کے حقوق دیکھے جاتے ہیں، سب انسان آدم کی اولاد ہیں، اس تعلق سے آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں، اور ایک ساتھ رہنے کی بنیاد پر ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں، لہذا پڑوسی پر پڑوسی کا جو حق ہے اس کو دیکھنا چاہئے، اور جب سب انسان ہیں تو ایک انسان کا حق دوسرے انسان پر، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، کسی خاندان کا ہو، کسی طبقہ کا ہو، اس کو انسانی بنیاد پر اس کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہئے۔

ایسی مشترک اجتماعیت کے لئے جس میں مختلف مذہب، مختلف نسلیں، مختلف نوع کے روابط ہوں جیسا کہ ہمارے ملک ہندوستان میں ہے جو اسی جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیاد پر اپنا نظام حکومت رکھتا ہے زیادہ کارگر اور جامع بنیاد یہی انسانی رشتہ ہی کی بنیاد ہے، یہ ایک ایسی بنیاد ہے جس کا لحاظ ہی ہر سوسائٹی میں کیا جاسکتا ہے جو مذہبی اور طبقاتی لحاظ سے یہ تنوع رکھتی ہو، اس لحاظ سے کوئی بھی انسانی معاشرہ متنوع ومختلف بنیادوں پر مشتمل اجتماعیت رکھتے ہوئے اور یکسوئی اور یکجہتی سے اور مثبت انداز میں ترقی کرسکتا ہے، اور خطرات سے محفوظ رہ سکتا ہے، اور اس طریقہ سے انسان کے انسان کے ساتھ دوسرے قسم کے تعلقات متأثر بھی نہیں ہوتے اور زندگی آپسی تعاون اور ایک دوسرے کا لحاظ رکھتے ہوئے چلتی ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد ضرورت تھی کہ (یہ ملک ہندو مسلم سکھ عیسائی کی مل جل کر کوشش سے آزاد ہوا)، ہندوستان کے رہنے والوں کے تحفظ وترقی کے مسائل کو بھی یہ سب فرقے مل جل کر حل کرتے اور اجتماعی زندگی کو خوشگوار بنانے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے، ہندوستان کا دستور بھی اسی طریقہ کو واضح کرتا ہے، لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آزادی کے بعد مسائل کے حل کرنے میں خاندانی، مذہبی اور طبقاتی رشتوں کو زیادہ اپنایا جانے لگا، اس کی وجہ سے وطنی اور ملکی مفادات کو مدد ملنے میں بڑی کوتاہی ہوئی، اور دیگر طبقاتی اور مذہبی ٹکراؤ اور کشمکش کے حالات پیدا ہوگئے انسانی رشتہ کے تقاضے بھی اس میں نظر انداز ہونے لگے اس کی وجہ سے ملک میں یکجہتی کے ساتھ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں، یہ بڑی قابل اصلاح کمزوری اور نقص ہے، جس کی طرف توجہ اچھے اچھے اہل دانش نے بھی بہت کم کی، ہر ایک نے اپنی کسی محدود اجتماعیت کی فکر تک اپنے کو محدود رکھا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ جو اگرچہ بنیادی طور پر مذہبی اور علمی

وتعلیمی آدمی تھے اور مذہبی، علمی وتعلیمی کاموں میں لگے ہوئے بھی تھے، لیکن ان کو اس بات کا بہت احساس ہوا، مولانا کو خیال ہوا کہ انسانی رشتہ کی بنیاد پر ہر ایک پر اس کے لئے فکر وتوجہ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اسلام کے لحاظ سے حلف الفضول میں بھی حضور سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی تائید ملتی ہے، چنانچہ انہوں نے خود اس کام کا آغاز کیا کہ انسان کو انسان کی ہمدردی کرنا چاہئے اور اس کو تحریک بنانے کی کوشش کی اور اس کا نام ''حلقہ پیام انسانیت'' رکھا۔

❖ ❖ ❖

رجوع الی اللہ اور تدبیر محکم کے بغیر کامیابی نہیں

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے فلاح وسربلندی کے حصول کی راہ میں انسانی زندگی کے طرز عمل کے دو پہلوؤں کی پابندی مقرر فرمائی ہے، ایک پہلو ہے علم وتجربہ میں آئی ہوئی مناسب عملی تدبیر اختیار کرنے کا، اور دوسرا پہلو ہے اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں احکام الٰہی کی اطاعت اور رضائے الٰہی کی پابندی کا، مسلمانوں کی زندگی میں مختلف موقعوں پر جب بھی ان دونوں پہلوؤں پر عمل کیا گیا تو کامیابی اور سربلندی ان کے حصہ میں آئی اور جب بھی ان دونوں پہلوؤں یا ان میں سے کسی ایک پہلو میں کوتاہی ہوئی، کامیابی وحصول مقصد میں کمی یا محرومی سے سابقہ پڑا، مسلمانوں کی تاریخ اس بات کے متعدد اور مختلف نمونے پیش کرتی رہی اور ہماری زندگی کے حالات کے لئے اس سلسلہ کی رہنمائی پیش کرتی رہی ہے، ہم کو اس بات کا مسلمانوں کی سیاسی واجتماعی زندگی کے مختلف نشیب وفراز میں ملتا ہے اور عہد اول کے واقعات سے بھی اس بات کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں، خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (جن کی ہدایات ورہنمائی میں امت اسلامیہ کو تا قیامت چلنا ہے) ان دونوں پہلوؤں کا پورا لحاظ فرماتے تھے مثلاً تدبیر وحکمت عملی کے پہلو سے دیکھا جائے تو آپ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر مدینہ منورہ پر حملہ آور دشمن کے مقابلہ کے لئے شہر کے سامنے

خندق کھودنے کی تدبیر اختیار فرمائی حالانکہ عربوں میں یہ طریقۂ کار معروف نہیں تھا وہ ایران میں اختیار کیا جاتا تھا جس کا مشورہ حضرت سلمان فارسیؓ نے دیا جس کو آپؐ نے قبول فرمایا، اور غزوۂ احد کے موقع پر دشمن پر نظر رکھنے کے لئے دشمن کے جماؤ کے قریب ایک چھوٹی پہاڑی پر مسلمان سپاہیوں کا ایک دستہ بطور تدبیر بٹھایا تا کہ اس پہاڑی کی آڑ لے کر دشمن دوسری طرف سے پہنچ نہ جائے اور پیچھے سے حملہ نہ کردے، اس احتیاطی تدبیر کو یہ سوچ کر ترک نہیں کر دیا کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور مسلمان سب کے سب اللہ کے صالح بندے ہیں، اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے، اتنی احتیاط کی ضرورت نہیں، آپ کا طریقہ پوری طرح تدبیر اختیار کرنے کا بھی ہوتا تھا، دوسری طرف آپؐ اپنے رب کے حضور میں اس طرح دعا مانگتے اور مدد طلب کرتے تھے کہ گویا آپؐ نے کوئی تدبیر ہی نہیں کی، اپنے پروردگار کے حکموں کی بجا آوری، اس سے مدد کی طلب اور اس پر بھروسہ کا عمل پوری توجہ کے ساتھ اختیار فرماتے تھے۔

ہم کو اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلمانوں کی عزت وذلت کے سلسلہ میں مذکورہ بالا دونوں پہلوؤں کی رعایت اور ان میں کوتاہی کے علحدہ علحدہ نتائج واثرات کی واضح مثالیں ملتی ہیں، یہ دونوں پہلو! کہ ایک طرف تو تدبیر محکم ہو اور دوسری طرف رجوع الی اللہ اور اس کے حکموں کی پابندی ہو اسلامی تاریخ میں ان دونوں کی فکر جب بھی کی گئی، کامیابی اور سرخروئی حاصل ہوئی، اور جب ان دونوں یا ان سے کسی ایک میں کوتاہی ہوئی تو نقصان سامنے آیا، اس بارہ میں صحابۂ کرام کی جد وجہد اور میدان عمل میں ان کی کوششوں کے سلسلہ میں اسی طرح کی واضح مثالیں ملتی ہیں، غزوۂ احد میں پہاڑی پر حفاظتی دستہ بٹھانے کی تدبیر کو حفاظتی دستے نے آخر تک نہ نبھایا جس کے نتیجہ میں بڑا نقصان بلکہ وقتی طور پر شکست کا سامنا کرنا پڑا، مسلمانوں کی ایک قابل ذکر تعداد شہید ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہ کے حفاظتی گھیرے

میں وقتی طور پر زبردست کمی ہو جانے سے مجروح ہونا پڑا، دوسری طرف غزوۂ حنین میں اس سلسلہ کے دوسرے پہلو میں کمی ہونے کا اثر ظاہر ہوا وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد کو کامیابی کا اصل ذریعہ سمجھنے میں بھول کا واقعہ ہو جانے کی وجہ سے نقصان پہنچا اور وقتی شکست کا سامنا ہوا، اگر چہ تدبیر کا پہلو مکمل تھا لیکن اس کے مکمل ہونے کا ان کو ایسا احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد کی طلب میں کمی ہوئی تھی اور مسلمانوں کو یہ خیال آ گیا تھا کہ آج ہم ایسی بڑی تعداد رکھتے ہیں کہ دشمن ہم کو دبا نہ سکے گا، اس کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ تم کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

ان مثالوں سے صحابۂ کرامؓ نے اپنی کوششوں میں کامیابی کے لئے دونوں پہلوؤں کے مکمل ہونے کی ضرورت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا مسلمانوں کی مضبوط جمعیت کے ساتھ ایرانی دشمن کا سامنا ہوا اور درمیان میں دجلہ حائل ہوا تو انھوں نے اپنے معاونین سے کہا کہ لشکر کے لوگوں میں گناہوں کا ایسا حال تو نہیں کہ اللہ کی نصرت میں کمی کا باعث ہو، انھوں نے جائزہ لے کر بتایا کہ الحمد للہ لشکر صلاح و دین داری میں مکمل ہے یہ اعتماد حاصل ہونے پر انھوں نے گھوڑوں کے ساتھ دریا میں گھس جانے کا حکم دیدیا اور بآسانی دریا سے پار ہو گئے دشمن یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا، دراصل اللہ تعالیٰ یہ دیکھ کر کہ مسلمانوں کی کوشش میں دونوں پہلو درست ہیں، اپنی خصوصی مدد سے نوازتا ہے اور یہ بات خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ ہوتی ہے، کیونکہ ان کا معاملہ اپنے پروردگار کی خصوصی مدد ہی سے چلتا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کے بعد بھی ہم تاریخ اسلام پر جب نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو اس بات کی کافی مثالیں ملتی ہیں، ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ ماضی میں مسلمانوں کو شکست و نقصان سے جب بھی سابقہ پڑا، ان دو پہلوؤں کی تکمیل میں کمی ہونے کی

صورت میں پڑا، کہیں تو تدبیر کی کمی نقصان کا باعث بنی، اور کہیں رجوع الی اللہ اور دینی حالت کی کمزوری شکست کا باعث بنی، ہم موجودہ دور کے حالات پر بھی جب نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو اس نوع کی کوتاہی وکمزوری نظر آتی ہے، آج پورا عالم اسلام جن مصیبتوں اور شکستوں سے گذر رہا ہے، مذکورہ بالا اصول کو سامنے رکھتے ہوئے جائزہ لیا جائے، ہم کہیں تو مذکورہ بالا دونوں پہلوؤں اور کہیں ان دو میں سے کسی ایک پہلو میں کوتاہی یا کمی پائیں گے، لہذا ضرورت ہے کہ ہم کامیابی کی طلب کے معاملہ میں اپنے کو دونوں پہلوؤں سے مضبوط بنائیں، ہم ایک طرف حسب ضرورت اور بہتر سے بہتر تدبیر وحکمت عملی کا اہتمام کریں اور دوسری طرف ایمان واعتماد علی اللہ کا مطلوبہ معیار اپنائیں، ہماری کامیابی اور حصول عظمت کا انحصار اسی جامعیت میں ہے، کیونکہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کا یہ حکم:

﴿واعدّو لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدو كم﴾ (سورۃ الأنفال/ ۸-۶۰)

"تم ان کے مقابلے کیلئے اپنی طاقت وقوت کی تیاری کرو، اور گھوڑوں کے تیار رکھنے کی کہ تم اس سے اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ رکھ سکو۔"

اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان ہے کہ: ﴿وانتم الاعلون إن كنتم مؤمنين﴾ تم ہی سربلند رہو گے اگر تم ایمان والے ہو۔ مسلمانوں کے ان دو پہلوؤں میں ایمان وحکم الٰہی کی پابندی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، تدبیر محکم کے لئے بقدر استطاعت وامکان مکلّف کیا گیا ہے، ایمان وطاعت الٰہی کی شرط پوری ہو پھر استطاعت بھر تدبیر ہو تو تدبیر میں ضرورت کے مقابلے میں کچھ کمی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ محض اپنی عنایت سے اس کو پوری کر دیتا ہے جیسا کہ غزوۂ بدر میں ہوا کہ دشمن نے مسلمانوں سے تین گنی طاقت سے حملہ کیا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کمی کو فرشتے بھیج کر پورا کر دیا کیوں

کہ ایمان وطاعت الٰہی کا پہلو بھاری تھا اور غزوۂ خندق میں استطاعت بھر کمی نہیں کی گئی تھی لیکن پوزیشن کمزور تھی، خندق کھود کر تحفظ کی تدبیر کی گئی تھی لیکن وہ دشمن کے مقابلہ میں پھر بھی کم تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آندھی وطوفان بھیج کر دشمن کو تتر بتر کردیا اور دشمن کو بھاگنا پڑا ان مثالوں کو ہمارے سامنے ہونا چاہئے موجودہ عہد میں تعلیم اور ذرائع ابلاغ بھی موٴثر تدابیر میں داخل ہیں ان کی طرف بھی پوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

آج ہمارے سامنے جو حالات ہیں اور ہم کو جس نقصان کا سامنا ہوتا ہے ہم کو اس کے اسباب مذکورہ بالا انھیں پہلوؤں میں ملیں گے ایک طرف بہتر سے بہتر تدبیر اختیار کرنے میں ہم کو کمی ملے گی دوسری طرف ہماری دینی وایمانی حالت دگرگوں وخراب ملے گی، ضرورت ہے کہ ہم دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کریں تو دینی سربلندی وکامیابی حاصل ہوگی جس کے ہم بحیثیت مسلمان مستحق ہیں، مذکورہ پہلوؤں میں کوتاہی کا نتیجہ عموماً خراب ہوتا ہے اور ایمان واخلاص، عمل اور فکرمندی کے ساتھ جدوجہد وحسن تدبیر اختیار کرنے پر کامیابی وسرخروئی کا صلہ ملتا ہے اور اس امت کو اللہ تعالیٰ نے مثالی امت بنایا ہے، اس کی تمام تر کامیابی عملی زندگی میں اس کے مثالی امت بننے میں ہی مضمر ہے، اس کو یہ فکر کرنا ہے کہ وہ اپنے طریق کار اور صفات وکردار دونوں میں معیاری اور مثالی ہو۔

❖ ❖ ❖

علمی ونشریاتی جدوجہد کی ضرورت

مغربی تہذیب وتمدن سے مرعوب ومتاثر اکثر وبیشتر لوگ اسلام سے خوف محسوس کرتے ہیں اس لئے کہ اسلام کے متعلق ان کی معلومات کا دائرہ مرد وعورت کے چند مسائل تک محدود ہے، اور انہیں ان سہولتوں اور حقوق کا علم نہیں جو اسلام اپنے ماننے والوں کو مختلف شعبہائے حیات میں انہیں عطا کرتا ہے، حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ کو دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کے اختیار کرنے کی اجازت ملتی تو آپ آسان وسہل کو اختیار فرماتے اور مشکل کو ترک فرما دیتے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے''۔

اسلام اپنے پیرو کاروں کو ماکولات ومشروبات میں سے پاکیزہ اور طاہر کے استعمال کی مکمل آزادی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے رزق حلال سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیا ہے چنانچہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

''پوچھو تو کہ زینت (وآرائش) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں جو خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں ان کو حرام کس نے کیا ہے''۔

لیکن مغربی تہذیب وتمدن کے دلدادہ لوگ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے، اور اگر کچھ جانتے بھی ہیں تو ان کا یہ جاننا نہ جاننے کے برابر ہے کہ ان کو یہ سہولیات کس طرح حاصل ہوسکتی ہیں؟ اسی بنا پر وہ اسلام سے خوف زدہ ہیں اور اس کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور جب تک ہم اسلام کے سلسلے میں ان کے اس خوف اور ناپسندیدگی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور اس راہ میں کوتاہی کرتے رہیں گے یہ بات پیش آتی رہے گی کہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے، بلکہ ہم اسلام کے داعیوں اور اس سے راہ فرار اختیار کرنے والوں کے درمیان آپسی کشمکش اور بحثوں سے بھی دوچار ہوں گے۔

موجودہ زمانہ ایجادات واکتشافات کا زمانہ ہے اور آج رہنمائی اور پیغام رسانی اور اس کو دل ودماغ میں راسخ کرنے کے وسائل وآلات ایجاد ہوچکے ہیں اور غیر مسلم اس کو اپنے غلط مقاصد کے لئے خوب استعمال کررہے ہیں چنانچہ ان لوگوں نے اپنی تحقیقات وتالیفات اور اپنے نظام تعلیم اور نشریاتی اداروں کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں کو بگاڑ دیا ہے اور ان کے ذہنوں میں مذہب اسلام، شریعت اسلامی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت پیدا کردی ہے، جب ہم کسی غیر اسلامی ملک کا سفر کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں کتابچے اور پمفلٹ تقسیم کرکے اور مکاتب ومدارس کا جال بچھا کر یہ مہم خوب چلائی جارہی ہے، اور جب ہم ان کتابی ذخیروں کو دیکھتے ہیں جن سے اسلام اور اسلامی تاریخ، اسلامی شریعت پر روشنی پڑتی ہے اور اس کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ حقائق کو خلط ملط کرکے پیش کیا گیا ہے اور تحریف کی گئی ہے اور ان کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اسلام جہالت پر مبنی ایک پسماندہ مذہب ہے اور وہ زندگی کے مسائل کا ساتھ نہیں دیتا اور اس میں زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں ہے، اس میں خواہشات نفس کی تکمیل کے لئے متعدد

بیویوں سے شادی کرنے کی کی اجازت ہے، اور شوہر کی نافرمانی کرنے کی صورت میں اس پر ظلم ڈھایا جاتا ہے، اور مارا پیٹا جاتا ہے، ہم کو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی گئی ایک کتاب کو بغور دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا مؤلف مشرقی علوم کا ماہر عالم ہے، اس میں اس نے اپنی تحقیق اور مطالعہ کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک غریب ملک میں پیدا ہوئے تھے اس لئے آپ نے اپنے قبیلہ کو اور اسی کے ساتھ ساتھ سارے عرب کو فقر وفاقہ کی زندگی سے نکال کر دولت وثروت کی طرف لانے کی کوشش کی اور مؤلف نے ایسے دلائل سے استدلال کیا ہے جس سے سادہ لوح لوگ دھوکہ کھا جائیں، اور اس کتاب میں یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک سیاسی لیڈر یا قومی قائد تھے اور جس وقت ہم کسی غیر اسلامی ملک میں جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں سے اسلام کے متعلق کچھ ذکر کرتے ہیں تو وہ اپنی ناقص معلومات اور بدگمانیوں کی وجہ سے حیرت زدہ رہ جاتے ہیں، وہ لوگ اپنی بدگمانیوں کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اسلام اپنے پیروکاروں کے ساتھ مشکل ترین اور انتہاپسندانہ رویہ اختیار کرتا ہے اور ان کے ذہنوں میں یہ تصور جاگزیں ہوتا ہے کہ اسلام ایک تنگ نظر دین ہے اور پسماندہ دور کی طرف لوٹنے کا حامی ہے، اور یہ مذہب عصر حاضر سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ تو غیر مسلم ممالک کی حالت تھی، لیکن جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہاں انہیں قیادت وسیادت حاصل ہے وہاں بھی موجودہ ثقافت اور تہذیب وتمدن کے پروردہ لوگوں کی کثیر تعداد ہے جن کے ذہنوں میں اس سے ملتے جلتے تصورات موجود ہیں۔

اس طرح کی صورت حال پیدا ہونے میں ہماری کوتاہیوں اور ہماری غلطیوں کا بڑا دخل ہے کہ ہم نے صحیح صورت حال کا جائزہ نہیں لیا اور اس میں اس بات کو بھی دخل ہے

کہ ہم نے اس بات کی طرف بہت کم توجہ دی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں اسلام سے بدگمانی ہے ان کے سامنے اسلام کی سچی تصویر اور اس کی روشن تاریخ کو اس کی نفع بخش شکل میں پیش کریں، ہم نے اسلام سے ناواقف لوگوں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرنے والے پمفلٹ اور کتابچے بھی ان کو پہنچانے کی کوشش نہیں کی، اور نہ اس بات کی فکر کی کہ غیر مسلم حلقوں میں ایسے سیمینار کیے جائیں جن سے اسلام سے ناواقف لوگوں پر اسلام کا امتیاز اور تفوق جو اسے دوسرے مذاہب پر حاصل ہے، روشن اور عیاں ہو جائے اور یہ بات بھی ان کے سامنے آشکارا ہو جائے کہ مذہب اسلام فطرت انسانی سے کس قدر قریب ہے، اسی طرح ہم نے نہ غیر اسلامی ممالک اور اسلامی ممالک میں ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنے کی طرف توجہ دی، اس میدان میں ہماری جدوجہد نہ ہونے کے برابر ہے، ہم اپنی ذاتی خواہش کی تکمیل پر بے انتہا روپئے صرف کرتے ہیں لیکن اجتماعی مصالح اور دعوتی اور ادبی وعلمی وسائل پر بہت کم خرچ کرتے ہیں اور جہاں تک تعلیمی میدان کا مسئلہ ہے تو اس میں ہمارے ان فارغین کی تعداد جو کسی علمی اور انتظامی شعبہ میں کوئی اہم ذمہ داری سنبھال سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو اسلامی احکام کا صحیح علم ہو اور اسلام کی روحانیت سے واقف ہوں اور بقدر ضرورت ان کے اندر ملکی سیاست کی صلاحیت بھی موجود ہو ان کے مقابلہ میں بہت کم ہے جو مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں اور اداروں سے فارغ ہوتے ہیں ان میں سیکڑوں اور ہزاروں مختلف میدانوں کے ماہر ہوتے ہیں اس کے باوجود کہ وہ اسلام کے احکام اور اس کی اصل روح سے واقف ہیں، ہم کوششیں انشاء پردازوں پر کیوں نہ صرف کریں جو علمی اور تحقیقات کا کام انجام دیں اور بہتر اسلوب اور فصیح وبلیغ زبان میں تصنیف وتالیف کا کام کریں جن کو اہل زبان پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں اور پڑھنے میں بھی وہ تحریریں بھلی معلوم ہوں اور اس میں وہ لوگ اسلامی حقائق کو دلکش پیرایہ اور اچھے اسلوب میں پیش کریں۔

جہاد کے صحیح مفہوم و معنی کو سمجھنے کی ضرورت

اس وقت دنیا میں خود غرضی، نفع اندوزی، ظلم وزیادتی کا عام چلن ہو گیا ہے، اچھے اچھے امن پسند اور انسانیت دوست عنوانات سے حق تلفی، دھاندلی، انسان کشی اور بربریت کی حرکتوں سے چھپایا جاتا ہے اور من مانی کی جاتی ہے، یہ طریقہ ناانصافی اور ظلم کا اور اپنے مالک وخالق کی نافرمانی کا طریقہ ہے، ضرورت ہے ایسے حالات کو بدلنے کی اور انسانیت کو صحیح اور خیر پسندی کی راہ پر لانے کی بھرپور کوشش کی جائے، اسلام میں اس کی تعلیم دی گئی ہے، بلکہ اسلام کا اہم ترین مقصد ساری انسانیت کو اس راستہ پر لانا ہے، اور اس پر چلانا ہے، جو انسانیت کے صلاح وفلاح کا راستہ ہے، انسانیت کی اصل صلاح وفلاح کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے جس کے لئے تمہید وذریعہ دنیا کی یہی زندگی بنتی ہے، اس صلاح وفلاح کو جاننے اور سمجھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو ذریعے بنائے ہیں، ایک ذریعہ انسان کی عقل وفہم ہے، کہ جو اپنی فطری حالت میں ہونے کی صورت میں زندگی کے اچھے برے کو سمجھ سکتی ہے، اور دوسرا ذریعہ وحی الٰہی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ منتخب انسانوں کو انسانی زندگی کی ان اچھی اور بری باتوں سے باخبر رکھا جن کو انسان کی عام عقل وفہم پوری طرح متعین نہیں کرسکتی، اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ وحی فرشتوں کے ذریعہ اور بغیر فرشتوں

کے بھی اپنے جن منتخب بندوں کی طرف بھیجی، وہ نبی کہلائے، ان میں آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے، جنہوں نے دین کی باتوں کو جن سے انسانی زندگی کی اچھی اور بری باتیں متعین ہوتی ہیں اللہ کے حکم سے اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایات کے لحاظ سے جامع اور وسیع شکل میں بتایا، اور محفوظ کر دیا، اور یہ بتایا کہ دین صرف عبادات کا نام نہیں، بلکہ وہ زندگی کے تمام طور و طریق پر حاوی ہے جو انسان کو اس کی زندگی کی خیر و صلاح و فلاح کی راہوں پر چلنا بتاتا ہے، اسی جامع و کامل ہدایات کا نام اسلام ہے، لفظ اسلام کے معنی ہیں، اپنے کو سپرد کر دینا جس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اطوار و اخلاق کو اپنے خالق و مالک اللہ رب العزت کی مرضی کے سپرد کر دیتا ہے، اللہ رب العزت جو انسانوں کا خالق ہے وہ انسانوں کے مزاج کو اور ضرورتوں کو اور صلاحیتوں کو جانتا ہے، اس لئے اس نے جو طور و طریق انسانوں کے لئے پسند فرمائے ہیں، وہ انسانوں کی ضرورت اور طاقت اور صلاحیت کے مطابق ہیں اور وہ انسان کے لئے صلاح و فلاح کی ضمانت بھی دیتے ہیں، اسلام میں انہیں ہدایات کو دین کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی دین کے ماننے والوں پر یہ ذمہ داری بھی رکھی ہے، کہ وہ اپنے کو صلاح و فلاح کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اس کے مطابق بنانے کی فکر کریں، اس کے لئے جو مناسب اور موزوں تدابیر ہیں وہ اختیار کریں، ان تدابیر کی ایک ترتیب رکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ ناواقف ہیں ان کو شفقت و محبت کے ساتھ واقف کرایا جائے، اسی کا نام دعوت ہے اسی طریقہ سے ہر مسلمان کی حیثیت داعی کی بھی ہو جاتی ہے، اور کم سے کم مسلمانوں کی ایک وقیع تعداد اس کام پر مامور رکھی گئی ہے اور اس ذمہ داری کی انجام دہی اللہ تعالیٰ کو بہت مطلوب ہے، کیونکہ وہ انسانوں کو بھلا دیکھنا چاہتا ہے، لیکن جبر و تشدد سے نہیں، بلکہ افہام و تفہیم سے یہ کام اللہ تعالیٰ کی نظر میں نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ اس کی رحمت

کو کھینچنے والا اور لانے والا ہے، اور یہ کام اگر کوئی بھی نہ کرے تو یہ کوتاہی انسانوں پر اللہ کے عتاب کے نازل ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔

ہمیں تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں اس کام سے بالکل پہلوتہی کی گئی وہاں وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناراضی کے اثرات پڑے جو مصائب کی شکل میں اور تباہی کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

دعوت کا کام افہام وتفہیم اور حکمت وموعظت کے ساتھ کرنے کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں تو اللہ نے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے مسلمانوں کو جو بھی معقول طریقے ہیں ان کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن ان ذرائع کے ساتھ جو مسلمانوں کے لئے انسانی طور پر قابل عمل ہوں اور اسی نقطہ سے وہ مرحلہ شروع ہوتا ہے جس میں مجبور ہو کر بعض مرتبہ کوشش کرنے والوں کو سختی کا رویہ اختیار کرنے کی نوبت آجاتی ہے، لیکن یہ سختی ظلم کو روکنے اور صحیح راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا مقابلہ کرنے کے لئے ہوتی ہے تا کہ انسانوں کو صلاح وفلاح کا راستہ بتانے کا کام انجام پا سکے، یہ بات جب طاقت کے اعلیٰ وسائل ہوں تو ان کے ذریعہ بھی عمل میں آتی ہے، لیکن کسی کو اس کے اختیار کردہ طریقہ زندگی کو زبردستی بدلنے پر مجبور کرنے کی اجازت نہیں، قرآن مجید میں آتا ہے، "لا اکراہ فی الدین" کہ دین کے معاملہ میں مجبور کرنا نہیں ہے، البتہ نصیحت وموعظت اور ابلاغ حق کو روکنے میں سختی اختیار کرے تو اس کے مقابلہ میں سختی کرنے کی اجازت ہے، قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿اذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وان الله علىٰ نصرهم لقدير﴾ "یہ بات ان لوگوں کے لئے بتادی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے کہ وہ مظلوم ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے"، اور یہ بھی قرآن مجید میں بتایا گیا کہ: ﴿ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوٰت ومساجد يذكر

فیها اسم الله کثیراً﴾ کہ اگر لوگوں کا ایک دوسرے کو روکنے اور دفع کرنے کا معاملہ نہ ہوتو یہ مختلف عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کو بہت یاد کیا جاتا ہے یہ سب ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔

اس طرح اس ضرورت کو بتایا گیا ہے کہ حق کی باتوں کو اور انسانوں کے صلاح وفلاح کے طریقوں کو لوگوں کو بتایا جائے اور ان کی زندگیوں کو راہ راست پر لایا جائے، تاکہ وہ اپنے خالق ومالک کی مرضی کے مطابق ہوسکیں، اور اس کام کو روکنے نہ دیا جائے، خالق ومالک کی عبادت کے سلسلہ کو بند نہ ہونے دیا جائے، یہ کام امن وآشتی کے ساتھ کیا جائے، لیکن اگر اس میں رکاوٹ ڈالی جائے تو اس رکاوٹ کو دور کیا جائے، اور اگر منظم رکاوٹ ڈالی جائے تو منظم طریقہ سے روکا جائے، اور روکنے کی ضرورت بتائی گئی ہے، لہذا اللہ کے بندے اس راہ میں کوشش اور محنت کرتے ہیں کہ خود ہی اپنے طور وطریق کو درست رکھنے کی فکر کرتے ہیں، اور پھر دوسروں کے طور وطریق کو بھی درست کرنے کے لئے حکمت ومحبت کے ساتھ کوشش کرتے ہیں، اور جب سختی کا ان کو مقابلہ پڑتا ہے تو وہاں ان کو سختی کا جواب دینا پڑتا ہے۔

اس پورے عمل کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے اور جہاد کے معنی اصلاً سعیٔ بلیغ کرنے کے یعنی ہمت اور عزم کے ساتھ پوری کوشش کرنے کے ہیں، اور یہ اللہ کو بہت محبوب ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس لفظ کے صحیح مفہوم اور معنی کو اس کے صرف ایک رخ کے ساتھ مخصوص سمجھا جانے لگا اور اس کا مطلب اسلام کے مخالفین محض لڑائی اور جھگڑے کے لینے لگے ہیں، حالانکہ اس سے جو عمل مقصود ہے وہ انسانوں کے ساتھ خیر خواہی اور ان کی خیر طلبی کا ہے، اس میں مقابلہ اور ٹکراؤ عموماً جواباً ہے اور مجبوری کا ہوتا ہے اور وہ اس کا صرف ایک رخ ہے، اور اس میں بھی یہ شرط ہوتی ہے کہ اس میں اصلاً اپنی ذاتی اور مادی اور دنیاوی منفعت پیش نظر نہ ہو، اس میں

خیر طلبی مقصود ہو، اور اچھے مقصد کے لئے اپنے جان و مال کی قربانی کے جذبہ سے ہو۔

دنیا میں اس وقت انسان کے لئے خیر طلبی کے بجائے دوسروں کے ساتھ ظلم کرنے اور لڑنے بھڑنے کی مثالیں عام ہوتی ہیں، ان میں اپنی اپنی صرف دنیاوی منفعت مقصود ہوتی ہے، یہ مثالیں ہر طرف بڑے پیمانہ پر وجود میں آتی رہتی ہیں، جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہو جاتی ہیں، اور یہ سب اپنے نفس اور اپنی دنیاوی خواہش کی تکمیل کے لئے کیا جارہا ہے، طاقتور فریق اس کو اختیار کرتا ہے، ہیروشیما اور ناگاساکی میں لاکھوں انسانوں کو ختم کر دیا گیا، فلسطین سے لاکھوں باشندوں کو اپنے گھروں سے نکال کر صحراؤں میں اور دوسرے علاقوں میں بھگا دیا گیا اور جو نہ نکالے جاسکے ان کو بمباری سے تباہ کیا جاتا رہا، اس مقابلہ میں کوئی غصہ میں انتقامی عمل اختیار کر لے تو کیا تعجب کی بات ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اس کام کو کر لیتے ہیں تو ان کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور بعض ان واقعات پر کہ جن کے اسباب انفرادی اور مقامی ہوتے ہیں ان کے حوالہ سے ابلاغ حق اور انسانیت کے فلاح و صلاح کے لئے کی جانے والی کوششوں کو بلا وجہ الزام دیدیا جاتا ہے اور اس کو تشدد اور دہشت گردی کا جھوٹا نام دے کر بدنام کیا جاتا ہے، اور افسوس کی بات ہے کہ یہ سوچے سمجھے طریقہ سے اور عداوت کے جذبہ سے کیا جاتا ہے، یہ بات پوری انسانیت کے لئے ایک بدخواہی اور مضرت رسانی کا عمل ہے، ہم اہل حق کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ جن کی معلومات اس سلسلہ میں غلط فہمی پر مبنی ہیں ان کے خیالات کو بھی درست کریں۔

❖ ❖ ❖

بین الاقوامی سیاست اور طاقت کا کھیل

اس وقت مسلمانوں کے تعلق سے دنیا کے مختلف خطوں بشمول ہندوستان میں جو حالات وحوادث پیش آرہے ہیں، ان کو ہمیں صحیح پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے تاریخی وسیاسی وعوامل کی روشنی میں دیکھنا چاہئے، دراصل ہمارا یہ دور اقتصادی اور سیاسی کاوشوں اور سازشوں کا دور ہے، اقتصادی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے مختلف پسندیدہ اور اثر انگیز عنوانات سے کام لیا جاتا ہے جس کے تحت کمزوروں کا استحصال ہوتا ہے اور مقصد اپنے اقتصادی مفاد کا حصول ہوتا ہے، یا اپنی سیاسی گرفت کو مضبوط بنانا ہوتا ہے یا اس کو ان کے وسیع دائروں تک پہونچانا ہوتا ہے، اس کی مثال باہری دنیا میں امریکہ اور روس جیسے عظیم ملکوں کی خارجہ پالیسی میں نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے، سب کی فکر سیاسی یا اقتصادی مقصد کے حصول کی ہے، اس مقصد کے حصول میں اگر کوئی فرد یا گروہ رکاوٹ کا سبب بنتا ہے تو اس پر میڈیا کے ذریعہ تخریب یا انسان دشمنی کا الزام عائد کرکے توڑنے یا بے اثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کو توڑنے اور بے اثر کرنے کی خاطر بعض قوموں اور مذہبوں کے چند لوگوں کے ذاتی جذباتی عمل کو اچھال کر پورے مذہب کو متہم کردیا جاتا ہے، طاقت وسیاست کا یہ کھیل عالمی پیمانہ پر ایک عرصہ سے جاری ہے، اس کے پس پشت عموماً اقتصادی یا سیاسی استحصال

کا مقصد کارفرما نظر آئے گا، یہ بات اب یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے، ایک استحصال کرنے والوں کی، دوسرے استحصال کئے جانے والوں کی، ان دونوں کے لئے خوبصورت اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں جن کے پیچھے وہ خودغرضانہ مقاصد پوشیدہ ہوتے ہیں جو طاقتور قوموں یا گروہوں کے پیش نظر ہیں مثلاً استحصال کرنے والے ملکوں کو ''ترقی یافتہ'' اور دنیا میں انصاف اور انسانی قدروں کا نقیب اور استحصال کئے جانے والے ممالک کو پسماندہ اور قابل اصلاح ممالک کے نام دئے جاتے ہیں، دو دہائیوں قبل روس اور امریکہ کا ٹکراؤ دو استحصال پسند طاقتوں کا ٹکراؤ تھا کہ دنیا کے لائق استحصال ممالک کس کے ماتحت کتنے ہوں، اس ٹکراؤ میں امریکہ کو فتح ہوئی اور اب وہی تنہا عالمی طاقت رہ گیا، لہذا اس کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ لائق استحصال ممالک کی نئی گروہ بندی طے کرے، گروہ بندی کے اس سیاسی واقتصادی مقصد کے لئے ترقی پذیر ممالک کہے جانے والے ممالک کے درمیان آپسی کشمکش، لڑائی اور اس طرح کی صورت حال بنائی جاتی رہی کہ مداخلت کا موقع نکلے اور آخر میں بیچ بچاؤ کرکے ان کو اپنے زیر اثر لے آیا جائے اور وہاں کے اقتصادی وسیاسی مفادات سے فائدہ حاصل کیا جائے یا ان میں سے کسی میں اگر بڑھتی ہوئی کچھ طاقت ہے جو استحصال پسند ملک کے لئے دشواری پیدا کرسکتی ہو تو اسے کمزور وبے اثر کردیا جائے۔

گذشتہ کئی دہائیوں کے دوران مشرقی ممالک کے درمیان ہونے والی جنگوں میں اس سیاست اور مقصد طلبی کو اچھی طرح دیکھا جاسکتا ہے خواہ وہ عراق وایران کی جنگ ہو یا عراق وکویت کی لڑائی ہو، ان سب کے پس منظر میں سیاسی یا اقتصادی استحصال کی کارفرمائی کو محسوس کیا جاسکتا ہے، مشرقی ممالک میں سے بعض کی بعض سے سیاسی کشمکش کو بھی کسی حد تک اسی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے، ہندوستان

دیا کستان اپنے مختلف حالات کے لحاظ سے تقریباً اسی بلا میں گرفتار رہے ہیں، اگر ان کے ٹکراؤ کے پس منظر پر نظر ڈالی جائے تو دونوں ملکوں کے درمیان ٹکراؤ اور لڑائی کا کوئی معقول سبب نہیں ہے جب کہ دونوں ملک گوناگوں حالات ومعاملات میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، دریاؤں اور پانی کے معاملہ میں دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، بنیادی لحاظ سے دونوں کا ثقافت وکلچر ایک ہے، مذہبی لحاظ سے بھی دونوں جگہ مذہبوں کا پھیلاؤ تقریباً یکساں ہے، علاقائی حالات اور مصلحتوں کے لحاظ سے بھی دونوں ایک ہی راستہ کے مسافر ہیں پھر دونوں میں یہ ٹکراؤ اور دشمنی کیسی ہے؟ دونوں ملکوں کے ذمہ داروں کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کہیں غیر طاقتوں کی مصلحتوں کا شکار تو نہیں بنائے جا رہے ہیں، اس پر نظر نہ ڈالنا بڑی بھول شمار کی جاسکتی ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ ان ملکوں کے بااقتدار طبقہ میں یہ رجحان سرایت کر گیا ہے کہ اس کو اپنے ذاتی یا اپنی پارٹی کے فائدہ کے لئے انہی تدبیروں کو اختیار کرنا ہے جن سے استحصال پسند طاقتیں فائدہ اٹھاتی ہیں، اس طریقہ سے وہ بڑی طاقتوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں، مذہبی جذبات کو مصنوعی طریقہ سے ابھار کر دو بڑے مذہبوں کے ماننے والوں کو لڑائی میں مشغول کر دینے اور ان کی اس مشغولیت سے فائدہ اٹھانے یا مذہبی اسباب کو بہانہ بنا کر دونوں برادر ملکوں کے درمیان جنگ کا مہیب بادل اٹھانے سے اصلاً اپنے سیاسی یا اقتصادی مقاصد حاصل کرنا پیش نظر ہوتا ہے۔

اس پس منظر میں ہندوستان کے ہندو مسلم قوموں کے مابین کے حالات کو دیکھا جائے تو ''رام جنم بھومی'' کا نعرہ سیاسی اقتدار کی رسہ کشی کا مسئلہ نظر آئے گا، گہری نظر سے دیکھا جائے تو خالص مذہبی مقصد اس کی اصل بنیاد میں نہیں ملے گا، سیاسی واقتصادی طالع آزمائی ہوگی یا اقتدار کے باقی رکھنے یا اس کو حاصل کرنے کی طلب اس کی اصل وجہ نظر آئے گی، ہندوستان میں موجودہ ہندو مسلم تناؤ کے تاریخی پس منظر

پر نظر ڈالی جائے تو اس کا سرا بدیسی حکومت کے عہد سے ملتا نظر آئے گا، ہندوؤں میں مسلم دشمنی اور مسلمانوں میں ہندو دشمنی کو جارحانہ بنانے کا کام بدیسی حاکموں کی سرپرستی میں کیا گیا، اسی کے ساتھ سیاسی سطح پر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کا آغاز ہوا، تقسیم ملک سے عداوت کے جو واقعات پیش آئے وہ سیاسی سطح پر فائدہ اٹھانے کا بڑا ذریعہ بن گئے، ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی اصل بنیاد مذہب نہیں ہوگا، بلکہ اصل بنیاد کوئی سیاسی مفاد یا اقتصادی مفاد ملے گا جس کو مخفی رکھنے کے لئے مذہب کو بڑا ذریعہ اور حربہ بنایا گیا، مشرقی ممالک میں مذہبی جذبہ چونکہ عوام کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے مؤثر ترین ذریعہ ہوتا ہے اس لئے طالع آزما لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، اس طریقہ سے وہ اپنے اصل مقصد کو مخفی رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور اپنے اصل مقصد کا فائدہ اس چابکدستی اور ماہرانہ فنکاری سے حاصل کر لیتے ہیں کہ ان پر غیر مخلص اور خود غرض ہونے کا الزام نہیں لگتا اور ان کو فائدہ حاصل ہو جاتا ہے، ایسے موقعوں پر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ مذہب کی بنیاد پر سیاست چلانے والوں کی خاصی تعداد اپنی نجی زندگی میں خود مذہب پر زیادہ عامل نہیں ہوتی، اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ایسے سیاسی قائدین مذہب کو بنیاد بنا کر اپنے مطلوبہ مقصد کے لئے ہر قربانی کا اعلان کرتے ہیں جب کہ ان میں ایک تعداد خود اپنی نجی اور عائلی زندگی میں مذہب سے دور ہوتی ہے، اور نتیجہ میں انھیں قربانی دینے کی ضرورت نہیں پڑتی، ان کے نعروں کی بدولت قربانی عوام کے حصہ میں آتی ہے۔

افغانستان میں امریکہ نے ان ہی لڑاکوں کی مدد سے لڑائی لڑی ہے جو خود امریکہ کے مسلح کردہ تھے، خود امریکہ کو انھیں مسلح کرنے اور روس کو ترکستانی و افغانستانی علاقوں سے بے دخل کر کے اس اہم خطہ پر اپنے اثر و رسوخ کو جمانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اس لڑائی کے پیش نظر وہ امریکہ کے نزدیک اچھے تھے، لیکن اب جب کہ وہ حامی اور مؤید نہ رہے تو ختم کر دئے جانے کے سزاوار اور مستحق ٹھہرے۔

مشرق وسطیٰ میں مغربی سامراج کی ریشہ دوانی اور ظلم

مشرق وسطیٰ کے علاقوں میں اور خاص طور پر مغربی ایشیا کے متعدد خطوں میں جو علی العموم مسلم ممالک کے تحت آتے ہیں گذشتہ کئی دہائیوں سے امریکہ کی سامراجی اور استحصالی پالیسی کا جو جابرانہ اور غیر جمہوری کھیل کھیلا جا رہا ہے، اور اب چند برسوں سے عراق کا خطہ اس کا بے دردی کے ساتھ نشانہ بنا ہوا ہے اس کو ساری دنیا محسوس کر رہی ہے کہ اس میں انسانیت سوز اور ظالمانہ کاروائی کا بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے، کچھ دنوں قبل اسی طرح کا رویہ افغانستان میں اختیار کیا گیا تھا، اب عراق میں کیا جا رہا ہے، کمزور شہریوں اور بے گناہ لوگوں کو محض وہم اور غیر مصدقہ شکایتوں پر جیلوں میں ڈال کر بازپُرس کرنا اور اس مقصد سے ان کو طرح طرح کے غیر انسانی طور طریق اختیار کرتے ہوئے اذیتیں پہونچانا، اور پھر ایسے ظالمانہ طرز عمل پر اگر مظلوموں کی طرف سے احتجاج و ناگواری کا اظہار کیا گیا ہو تو وہاں محض اندازہ کی بنیاد پر بے گناہ آبادی کو بمباری سے سزا دینا، اور اس میں مسجدوں اور عبادت خانوں کی بھی پروا نہ کرنا، یہ مغربی قوتوں کی عہد وسطیٰ کی سفاکانہ اور ظالمانہ روش کی یاد دلاتا ہے، اور اسی سے ملتا جلتا وطیرہ ابھی ماضی قریب میں مغرب کی استعماری طاقتوں کا مشرقی ممالک پر اپنی حکومتیں قائم رکھنے کے لئے رہا ہے، ان مغربی طاقتوں نے مشرقی ممالک کو گذشتہ دو تین صدیوں سے غلام بنا رکھا تھا، اور ان کو اپنی غلامی میں باقی رکھنے

کے لئے وہاں سختی اور ظلم کا پورا استعمال کیا تھا، لیکن آزادی کی تحریکوں کے اثر سے بالآخران ملکوں کو ظاہری طور پر آزاد کیا۔

اس وقت تک امریکہ کی طرف سے جابرانہ اور سامراجی طرز عمل کا اظہار نہیں ہوا تھا، اس کی وجہ سے عام ذہنوں میں امریکہ کو انسانی آزادی اور جمہوریت کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا، لیکن امریکہ کو جب اپنی اقتصادی اور سیاسی ضرورتوں کے لئے مشرقی ممالک کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے پہلے تو ہمدردی کا رویہ ظاہر کر کے اپنے سے قریب کرنے کا طریقہ اختیار کیا، اور جب اس سے اس کی ضرورت پوری نہ ہوسکی تو وہی جبر وفریب کے طریقے اختیار کرنا شروع کر دیئے جو اس کے پیش رو مغربی سامراجی قوتوں نے اختیار کئے تھے، اور جب مظلوم ممالک کی طرف سے احتجاج یا نافرمانی کا اظہار ہوا تو اس نے اپنے استحصالی مقاصد کے لئے ظلم اور سفاکی سے بھی گریز کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، امریکہ کو اپنے مذکورہ جبر واستحصال کی پالیسی اختیار کرنے میں مزید مدد اس سے بھی ملی کہ امریکہ میں یہودی آبادی کے دانشور اس کے قریب ترین مشیر ومعاون ہیں، اور امریکی حکام پر ان کا رسوخ اور اثر بہت غیر معمولی ہے، اور یہودیوں کے تو پروٹوکول ہی میں جو انھوں نے آج سے سو سال پہلے طے کیا تھا اپنے دنیاوی فائدہ کی خاطر اور اپنے قومی اور مذہبی مفاد کے لئے دیگر قوموں اور مذہبوں کے افراد کے انسانی حقوق تک کو پامال کرنے میں حرج نہیں قرار دیا گیا ہے، بلکہ خود اپنی قوم کے برخلاف دیگر قوموں اور مذہبوں کے افراد کے انسانی مفادات کو اپنے قومی ومذہبی مفاد کے لئے ختم کر دینے کی باقاعدہ پالیسی بنا رکھی ہے، اسی پالیسی کو خاصی حد تک امریکہ جیسے بڑے ملک کے ذریعہ جس پر یہودی لابی کو پورا غلبہ اور اثر ونفوذ حاصل ہو چکا ہے، خودغرضانہ ڈپلومیسی اور سرمایہ دارانہ جبر وزیادتی کے ذریعہ اپنایا جاتا ہے، جس میں امریکہ کا اپنا خودغرضانہ

مفاد بھی شامل ہو جاتا ہے۔

یہود نواز امریکہ کی موجودہ کوششوں کے سلسلہ میں دو نشانے نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں ایک تو معدنی ذخائر کے ان علاقوں پر امریکہ کا تسلط قائم کرنا تا کہ ان ذخائر سے فائدہ اٹھایا جا سکے، دوسرے اپنے پروردہ یہودی قومیت کے مطالبہ کو پورا کرنے اور فلسطین پر اس کے ناجائز قبضہ کو مضبوط کرنے میں بھر پور مدد دینا، یہود کے اس مطالبہ میں ایک تو فلسطین اور اس کے قرب وجوار کے وہ علاقے ہیں جہاں یہودی نسلوں کی آج سے کئی ہزار سال قبل بود و باش تھی، اور بعد میں وہ وہاں سے منتقل ہو گئے تھے، دوبارہ وہاں آئے تھے، اور پھر وہاں سے نکالے گئے تھے، اب وہ پھر ان علاقوں کو ان کی موجودہ آبادی سے خالی کرا کر دوبارہ حاصل کرنا، اور وہاں یہودی شہنشاہیت قائم کرنا چاہتے ہیں، اور اس کو وہ اپنی کتاب مقدس کے حوالہ سے خدائی وعدہ قرار دیتے ہیں۔

یہودی نسل کے لوگ اسی کے ساتھ ساتھ اپنے یہودی افراد کے لئے اقتصادی برتری اور طاقت کے حصول کے لئے دنیا پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اگر وہ اس مقصد کو خود نہیں حاصل کر سکتے ہوں تو کسی بڑی طاقت کے کاندھوں پر بیٹھ کر حاصل کرنے کی تدبیر اختیار کرتے ہیں، اور اس کے لئے مضبوط ترین کاندھا انہیں امریکہ کا کاندھا ملا ہے، یہودی پروٹوکول کے مطابق ان یہودی مقاصد کے لئے غیر یہودی قوموں کے ساتھ کسی رعایت یا ہمدردی کی ضرورت نہیں تسلیم کی جاتی، بلکہ اس مقصد کے لئے استحصال اور جبر کے سب ممکنہ طریقے اختیار کرنے میں بھی حرج نہیں سمجھا جاتا۔

اس وقت امریکہ میں جو پالیسی چل رہی ہے اس میں خود امریکہ کے سامراجی اور استحصالی مقاصد تو کارفرما ہیں ہی، ان کے ساتھ مذکورہ یہودی عزائم کی رعایت بھی واضح طریقہ سے دیکھی جا سکتی ہے، حالانکہ امریکہ ایک عیسائی ملک ہے،

اور عیسائی مذہب کے ماننے والوں اور یہودی مذہب کے ماننے والوں کے درمیان بنیادی طور پر مذہبی اعتبار سے کوئی توافق نہیں ہے، کیونکہ یہودی قوم کے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بہت برا اور گندہ تصور رکھتے ہیں، اور انہوں نے اپنی دانست میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس کی پاداش میں سولی پر پہونچا دیا، حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام ایک بڑے برگزیدہ اور اپنے رب کے مقبول نبی تھے، اور وہ عیسائیوں کے لئے تو صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ ان کو عیسائی نبی سے بھی کچھ اوپر کا درجہ دیتے ہیں، اس کے علاوہ عیسائیوں کی یہودیوں سے دوری کی ایک وجہ یہودیوں کا وہ اقتصادی استحصال کا طریقہ رہا ہے، جو وہ عیسائیوں کے ساتھ بھی برتتے رہے ہیں، اس کی وجہ سے بھی عیسائی لوگ عموماً ان سے برگشتہ رہے ہیں، لیکن چونکہ موجودہ عہد میں دونوں کے سامنے مسلمان قومیں ہیں اس لئے دونوں طاقتیں اس مسئلہ میں آپس میں متحد و متفق ہوگئیں، اور مسلمانوں سے یہ دشمنی صرف آج کی نہیں ہے، بلکہ گذشتہ صدیوں میں ہونے والی صلیبی جنگوں سے تعلق رکھنے والی دشمنی ہے، اور اس کے لئے عرصہ قبل سے پلاننگ کی جاتی رہی ہو تو تعجب کی بات نہیں، کیونکہ گذشتہ دو تین صدیوں سے مغربی ممالک کی ریشہ دوانیاں مشرقی ممالک میں شروع ہوگئیں تھیں، اور ان کے ذریعہ مغربی طاقتوں نے اپنا اثر ورسوخ مشرقی ممالک میں بتدریج بڑھاتے ہوئے تقریباً ۶۰-۷۰ سال کے اندر ان اسلامی ممالک میں اپنے اثر ورسوخ کو مکمل غلبہ وتسلط تک پہونچا دیا تھا، اور اب جب کہ یہ مشرقی ممالک ظاہری طور پر آزاد کر دیئے گئے ہیں مغربی طاقتوں کی ڈپلومیسی اور وسائل طاقت میں برتری کے ذریعہ ان پر ان کو پورا رسوخ حاصل ہے، حتی کہ وقتاً فوقتاً یہ مغربی ممالک اپنی خودغرضانہ اور ظالمانہ کارروائیاں اس طرح کرنے لگتے ہیں جیسے بچے کھلونوں سے کھیل کرتے ہیں۔

اب اس وقت خصوصی طور پر جو ممالک امریکہ اور اس کے حلیفوں کے جبر

وزور دستی کی زد میں ہیں وہ بتدریج مغربی ڈپلومیسی کا شکار ہوتے ہوئے اس منزل پر پہونچ گئے کہ ان کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا ہے، اور سخت مقابلہ کی صورت بن گئی ہے جس کے سامنے دشمن کو انشاء اللہ پسپا ہونا پڑے گا، اور ظلم کی ایک حد ہوتی ہے، جس پر رب العالمین کی طرف سے بھی سزا دینے کا اور مظلوم کو ظلم سے نکالنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے، تاریخ انسانی میں ایسا ہوتا رہا ہے، البتہ ضرورت ہوتی ہے کہ مظلوم اپنے رب کی رحمت اور کرم کو اپنے اچھے اعمال کے ذریعہ سے کھینچ سکے، اور اپنے کو زیادہ سے زیادہ نیک سیرت بنانے کی کوشش کرے، تو خدا کی رحمت میں دیر نہیں ہوتی، ہم مشرق وسطیٰ میں جس میں عراق وفلسطین خاص طور پر قابل ذکر ہیں اب اس نتیجہ کی امید کرتے ہیں، اور رب العالمین سے دلسوزی کے ساتھ دعاء کرتے ہیں کہ مظلوموں کو ظلم سے نجات عطا فرمائے، اور ظالموں کو ان کے کرتوت اور ان کے جوروزیادتی کی سزا دے، آمین۔

❖ ❖ ❖

حالات کے صحیح تجزیہ اور حق پرستانہ حکمت عملی کی ضرورت

امت مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے خیر امت بنایا ہے، لیکن خیر امت کا یہ مقام محض کوئی نام یا تعارف کی علامت نہیں ہے، بلکہ یہ بڑی ذمہ داری اور اہم فریضہ کی ادائیگی کا عنوان ہے، اور وہ یہ ہے کہ حق باتیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کو بتائی ہیں ان کو وہ خود بھی اپنی زندگی میں جاری کریں اور دوسروں کو بھی وہ باتیں بتائیں، اور اس بات کی فکر کریں کہ دوسرے ان باتوں کو سمجھیں اور قبول کریں اس میں کسی پر زور وزبردستی کرنا نہیں، بلکہ صرف توجہ دلانے اور دوسروں کے علم میں لانے اور ان کے سمجھنے کے لائق طریقہ سے ان کے لئے واضح کرنے کا فریضہ انجام دینا ہے۔

کسی پر حق باتوں کو ماننے کے لئے زبردستی مجبور کر دینے کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائی ہوئی باتیں خود ایسی جامع اور انسانیت کے لئے فلاح و بہبود کی ہیں کہ عام سمجھ کا انسان بھی ان کو قبول کر لینے میں بہتری محسوس کر سکتا ہے سوائے اس کے کہ وہ صحیح طور پر علم میں نہ آئیں یا کوئی کسی مخالف جذبہ سے

نہ ماننے کی ضد پر اڑ جائے۔

اس وقت دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو بدگمانی یا مخالفانہ جذبہ ہے اس میں عام طور سے خود مسلمانوں کے اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کو دخل ہے جس فریضہ کی ادائیگی ان کے ذمہ کی گئی ہے ورنہ حالات دنیا کے وہ نہ ہوتے جو ہیں، اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں جہاں بھی حق بات کو مناسب اور معقول انداز میں پیش کرنے کا عمل ہو رہا ہے، وہاں اس کا خوش کن نتیجہ سامنے آرہا ہے، خود یورپ اور امریکہ میں جو لوگ دین حق کا تعارف محبت اور ہمدردی سے کراتے ہیں ان کی فکرمندی اور نیک عملی اور ان کے کام کی مقدار کے مطابق نتائج بھی سامنے آرہے ہیں، ۱۱ر ستمبر کے سنگین تباہ کن حادثہ سے پہلے امریکہ میں مسلمانوں سے نفرت کا کوئی جذبہ نہیں تھا، اس وقت سالانہ بیس ہزار اشخاص کے اسلام کو ماننے کا اوسط بتایا جا رہا ہے تھا، ۱۱ر ستمبر کا حادثہ کس طرح سے ہوا یہ ابھی تک واضح نہیں ہے، مسلمانوں پر اس کا الزام بھی صحیح نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ مسلمانوں کے پاس ایسے وسائل نہیں اور ایسی خصوصی صلاحیتیں نہیں کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ اور حفاظتی انتظام والے ملک میں ایسا بڑا حادثہ کرائیں، بہرحال پروپیگنڈہ چونکہ یہ ہوا کہ یہ حادثہ مسلمانوں نے کیا اس سے امریکہ کے ملک میں مسلمانوں کے خلاف ناراضگی اور ناپسندیدگی کا جذبہ پیدا ہوا، اس جذبہ کا نقصان جو بھی رہا ہو، لیکن اس سے یہ نئی بات ہوئی کہ امریکی پڑھے لکھے لوگوں کو مسلمانوں اور ان کے مذاہب کے بارے میں تجسس ہوا کہ یہ برے لوگ کون ہیں، ان کو ان کا مذہب کیا سکھاتا ہے، چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کیا اور واقفیت ہوتے ہی ان میں سے بہت سے لوگوں میں نفرت پسندیدگی میں تبدیل ہوگئی اور سال بھر میں بجائے بیس ہزار کے چالیس ہزار غیر مسلموں نے اسلام کو پسند کر لیا، اس مثال سے اسلام کی حقانیت کی

کشش کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک دو نہیں اتنی بڑی تعداد میں لوگ حقیقت سے واقف ہو جانے پر دشمنی سے محبت و پسندیدگی میں تبدیل ہو گئے، اور اب جو نئے اعداد و شمار آئے ان سے اندازہ ہوا کہ وہ سابقہ اوسط جو بیس ہزار کا تھا وہ چالیس ہزار کا ہو گیا۔

اگر مسلمان دعوت کے فریضہ کو اپنی زندگیوں کو اسلامی سیرت کا نمونہ بناتے ہوئے انجام دیں تو اس کے بڑے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں اور ان کے مصائب اور پریشانیوں میں بہت کمی آ سکتی ہے اور وہ اس سے عند اللہ سرخرو اور کامیاب بھی ہوں گے، اور یہ جو سیاسی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ مختلف ملکوں میں واقعات پیش آ رہے ہیں، کے نقصانات بھی کم ہوں گے کیونکہ سامنے سے اسلام اور مسلمان دشمنی کی کیفیت ہٹ جائے گی اور مسئلہ خالص سیاسی یا معاشی رہ جائے گا جس کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے مناسب حکمت عملی سے ان کو روکنے کی کوشش کی جا سکتی ہے، مسلمانوں میں اگر اپنے پروردگار کی اطاعت اور دین کی نصرت کا صحیح جذبہ ہو اور اس کی صحیح فکر ہو اور اس پر ہمدردی اور انسانی خیر خواہی کے بتائے ہوئے جذبہ سے عمل ہو تو مسلمانوں کے مخالفوں میں بھی مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ نہیں رہے گا، پھر مسئلہ صرف کاروباری اور دنیاوی فائدے کے حصول کا رہ جائے گا اور اس کا مداوا زیادہ مشکل نہیں۔

مشرق وسطیٰ میں مغربی سامراجی طاقت کی طرف سے جو ہوا ہے، اس کے پیچھے اصلاً سیاسی اور اقتصادی فائدہ اٹھانا مقصود ہے اور چونکہ وہاں کی قومیں مسلمان ہیں اور میڈیا نے مسلمانوں کو خاص طور پر بدنام کیا ہے اس لئے ان میں اسلام دشمنی کا رویہ بھی شامل ہو گیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھیں، مشرق وسطیٰ کے یہ مسلمان حکومتوں کے ذمہ دار خواہ فوجی زمرہ کے ہوں یا سیاسی زمرہ کے ہوں سب مغربی تعلیم و تربیت کے پروردہ ہیں جن کو مغربی سیاست دانوں اور دانشوروں سے زیادہ عقیدت ہے اور اسلام کو وہ اپنا آبائی مذہب

سمجھتے ہوئے صرف قومی جذبہ سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس لئے مغربی حکومتوں کے سیاست داں اور دانشور، ان کو آسانی سے اپنا آلہ کار بھی بنا لیتے ہیں اور کم از کم اپنی حکمت عملی سے ان سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں، اس لئے بھی مغربی طاقتوں کو ان خطوں میں کامیابی حاصل کرنے میں کوئی بڑی دشواری نہیں ہوتی، پھر مزید یہ کہ ساری مشرقی حکومتوں کو مغربی سامراجی حکومتوں نے اپنے اقتصادی جال میں اس طرح پھنسا لیا ہے کہ وہ زیادہ ان کے خلاف جا نہیں سکتے، زبردست قرض لے کر اور اس کا زبردست سود ادا کرنے کے چکر میں اپنے ملک کو مضبوط کرنے اور اپنی پوزیشن کو خود دار اور پُرعزم بنانے سے قاصر رہتے ہیں اگر مغربی طاقتوں کی مخالفت بھی کرتے ہیں تو وسائل کی کمی کی وجہ سے اس میں زیادہ آگے نہیں جا پاتے، ضرورت ہے کہ مسلمان قوم حق کی پابند اور اپنی عزت وعظمت جو خدا کی طرف سے ان کو دی گئی ہے اس کے لئے اس کا لحاظ اور اپنے اقدامات میں عزیمت اور حالات کا صحیح جائزہ لے کر حق پرستانہ حکمت عملی اختیار کریں تو ان کو وہ پریشانیاں پیش نہ آئیں گی جن سے وہ دوچار ہوتے رہتے ہیں، ہمارے مسلم حکومتوں کے ذمہ دار اسلام کا نام لیں یا نہ لیں حقیقت میں ان کے دلوں میں مغربی سیاست دانوں اور دانشوروں کی وقعت زیادہ ہے اور ان سے رابطہ بھی ان کا زیادہ رہتا ہے اور ان کے حالات کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت بھی کم پڑتی ہے ایسی صورت میں بہت خوشگوار نتائج کے حاصل ہونے کی امید کم ہے، ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں اپنی دینی واسلامی ذمہ داری کا تصور بڑھایا جائے، اور ان کو اپنے دین پر صحیح عمل کرنے کے لئے تیار کیا جائے، اور اسلام کے مخالفوں کے مکر وفریب کو بھی سمجھا جائے، اس میں جس قدر بھی کامیابی حاصل ہوگی اسی قدر مرض کا مداوا ہوگا اور عزت حاصل ہوگی۔

❖ ❖ ❖

امت کے مسائل کا حل فرض منصبی کی ادائیگی میں ہے

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے امت وسط بنایا ہے یعنی مرکزی اور بلند مقام رکھنے والی اور دوسروں کی نگراں امت، مرکزی اور بلند مقام رکھنے کی حیثیت سے اس کو اعلیٰ کردار اور بلند معیار کا ثبوت دینا ہوتا ہے اور دوسروں کی نگراں امت ہونے کی بنا پر دوسری امتوں پر یہ نظر رکھنا ہوتا ہے کہ راہ حق اور اعلیٰ کردار کو اختیار کرنے میں ان کا کیا رویہ ہے، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: ﴿وكذلك جعلناكم أمة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا﴾۔

"اور ہم نے تم کو امت وسط (یعنی مرکزی اور بلند مقام رکھنے والی امت) بنایا تاکہ لوگوں کے نگراں و گواہ بنو۔"

اور اسی کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ مسلمانو! تم بہترین امت بنا کر انسانوں کے لئے بھیجے گئے ہو وہ یہ کہ تم ان کو اچھی باتوں کی تلقین کرو اور بری باتوں سے منع کرو، اس طرح مسلمانوں پر تین ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں ایک تو معیاری اور اعلیٰ کردار کے مطابق بننے کی، دوسرے دیگر لوگوں کو بھی معیاری اور اعلیٰ کردار کا بننے کی تلقین کرنے کی، اور تیسرے ان کے قبول حق اور ترک باطل کے عمل

پر نظر رکھنے کی، اس امت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان ہی ذمہ داریوں کا انجام دینے نہ دینے کے لحاظ سے ہوتا ہے، مسلمانوں کا ماضی اور حال بھی اسی کی شہادت دیتا ہے، اور اپنی ان ہی ذمہ داریوں کو نبھانے اور نہ نبھانے کے اعتبار سے عزت اور رحمت کے راستوں سے گذرتے ہیں، انھوں نے جب اپنے معیار کو صحیح رکھنے کی اور اس کے مطابق اپنی عملی زندگی بنانے کی کوشش کی، تو ان کو بلندی اور برتری حاصل ہوئی اور جب انھوں نے اپنی حالت سنوارنے اور اپنے اعلیٰ کردار کو جاری رکھنے میں کوتاہی کی تو ان کو دھکے لگے اور ذلت سے گذرنا پڑا، مسلمانوں پر جو سخت حالات اور ذلت آمیز واقعات ان کی تاریخ میں پیش آتے رہے ہیں وہ کبھی تو ان کی کوتاہیوں کی صورت میں سزا کے طور پر پیش آئے اور کبھی اعلیٰ معیار کو برقرار نہ رکھنے کی صورت میں بھی پیش آئے، یہ واقعات جب ان کی آزمائش اور امتحان کے طور پر پیش آئے تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھے کہ عزیمت اور ہمت ان میں کہاں تک قائم ہے، سخت حالات پیش آنے کی صورت میں مسلمانوں کو اولاً اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہئے کہ ان میں وہ کیا کوتاہیاں ہوسکتی ہیں جو اس طرح کی سزا کا سبب ہوسکتی ہیں اور پھر فوراً ان کوتاہیوں کو اپنے دامن سے صاف کرنے کی کوشش کرنا چاہئے تاکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ونصرت کو اپنے لئے واپس لائیں اور اگر غور کرنے پر بھی اپنے میں کوتاہیاں نہ نظر آئیں تو ان کو ان تکلیف دہ حالات کو اپنے رب کی طرف سے ایک امتحانی امر سمجھنا چاہئے اور یہ امید رکھنا چاہئے کہ یہ امتحان گذر جائے گا، اور ان کے صبر و رضا کا صلہ ان کو یہ ملے گا کہ ان کی ساکھ عزت قوت واپس ہو جائے گی، مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت ومرضی نافذ کرنے کے لئے کارگذاروں کی حیثیت عطا فرمائی ہے وہ اس کارگذاری کو اگر صحیح انجام دیتے ہیں تو کوئی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وعدہ فرمایا ہے کہ: ﴿وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين﴾۔

"کہ تم ہی سب سے سربلند ہوگے اگر ایمان والے ہوگے۔"

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ میں برابر ان باتوں کا ظہور ہوتا رہا ہے اور بعض مرتبہ امت مسلمہ پر ان کے دشمنوں کو ایسا غلبہ حاصل ہوا کہ یہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ اب مسلمان اس مسکنت وذلت سے نہ نکل سکیں گے لیکن پھر یہی ہوا ذلت ومسکنت سے سرخرو ہوکر نکلے۔ بلکہ ؏

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

ان کے دشمن خود سرنگوں ہوکر تابع دار بن گئے۔

اور اب تو عالم اسلام بہت بڑا اور وسیع ہو چکا ہے اور اس کے اقتدار وعزت کے ذرائع بھی بہت وسیع ہو چکے ہیں کمی صرف اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے کی اور اپنی کوتاہیوں اور حق سے روگردانیوں کو دور کرنے کی ہے، مسلمانوں میں ایک طرف شان وشوکت کا اظہار خاصا بڑھا ہے دوسری طرف غیروں کے اخلاقی وتہذیبی طریقوں سے بچنے کی کوششوں میں بھی بڑی کمی آگئی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ دشمنوں کی طرف سے کی جانے والی کارروائیوں اور حکمت عملیوں کو سمجھنے اور ان کا توڑ کرنے کی طرف توجہ دینے میں بڑی کوتاہی ہو رہی ہے اور اس کے لئے سودمند ذرائع اختیار کرنے میں بھی کوتاہی ہے، اس وقت تعلیم اور ذرائع ابلاغ قوموں کی عزت وذلت کے معاملہ میں بڑا کردار انجام دے رہے ہیں، اور ان دونوں کے سلسلہ میں مسلمانوں میں خاصی بے توجہی اور کوتاہی ہے، مسلمانوں کے معاشرے میں جو برے طور وطریق پھیلتے چلے جارہے ہیں ان کی اصلاح کی فکر بھی نہیں کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ کو مشرکانہ خیالات اور جاہلیت کے کاموں سے سخت نفرت ہے، اور یہ خیالات اس کی رحمت کو بہت دور کرنے والی باتیں ہیں، لیکن ہمارا معاشرہ غلط رسموں اور شرک کی کیفیت رکھنے والے

اعمال سے متاثر ہوتا چلا جا رہا ہے اور ان کو روکنے کا کام بہت ہی کم ہے یہ ہماری اندر کی خرابیاں ہیں اور باہر کے اعتبار سے ہم دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ مسلمانوں کے بدخواہوں کی طرف سے ان کو ظالم اور امن دشمن ثابت کرنے کے لئے ذرائع ابلاغ اور ذرائع تعلیم سے کیا کچھ نہیں کیا جا رہا ہے، بلکہ بہت سے واقعات فرضی کرائے جاتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ ذرائع ابلاغ کو مسلمانوں کو بدنام کرنے کا مواد مل سکے، حقیقت کچھ ہوتی ہے اور اس کو طاقتور ذرائع سے کچھ سے کچھ اور بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اس طرح اس وقت سارا عالم مل کر مسلمانوں کو نشانہ بنا رہا ہے جس کے اثر سے غیر تو غیر خود مسلمان دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کا جائزہ دینی اور دنیاوی دونوں لائنوں سے لیں اور غلطیوں کا تدارک کرنے اور کوتاہیوں کو دور کرنے اور امت مسلمہ کو جو چیلنج درپیش ہیں ان کا اہلیت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی مخلصانہ کوشش کریں، اس طرح امت مسلمہ ایک ناقابل شکست امت ثابت ہوگی اور کامیابی اور سرخروئی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے رکھی ہے وہ اس کو حاصل ہوگی۔

❖ ❖ ❖

مسلمانوں کی حکمت عملی کیا ہو؟

ہندوستان میں حالیہ سال مسلمانوں کے لئے خاصی فکرمندی اور تکلیف دہ حالات کے سال رہے ہیں، اور ابھی اس کے اثرات باقی ہیں، اس میں جارحانہ ہندو احیائیت کی وہ منصوبہ بندی، جس کا آغاز آج سے نصف صدی قبل ہوا تھا ایک حد تک برگ و بارلائی، اور اس نے اپنی کوششوں کی کھیتی سے کچھ پیداوار حاصل کی۔

ہندو احیائیت نے مخالف اسلام پروپیگنڈے اور مسلم دشمنی کے پرچار سے یہ کام شروع کیا تھا اور حکومتوں کے افراد اور ملک کے سیاست داں عام طور پر ان تخریبی کوششوں کو غیر اہم سمجھ کر، یا اس کو اپنے مذہبی تعصب کے ذہنی تقاضہ کے مطابق سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے تھے، حتیٰ کہ وہ وقت آگیا کہ اس منصوبہ بندی کے عملی نتائج سامنے آنا شروع ہوئے، جس کا اظہار گجرات میں ہوا، اور اگر ہندوستان کے سارے سیکولر پریس اور عالمی رائے عامہ نے اس کی مذمت نہ کی ہوتی تو شاید گجرات کے اس ایک طرفہ شر و فساد کو ایک ریہرسل کی حیثیت دیدی جاتی، اور آگے کے لئے قدم بڑھتا، اور ظاہر ہے کہ قدم اب جوڑ کے ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے، مسلم دشمنی کے بیانات آتے رہتے ہیں، اب یہ ملک کے سیکولر ڈھانچہ کو صحیح سمجھنے والوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ملک کے غلط رخ پر جانے کو کس طرح وہ روکیں، تا کہ ملک یکجہتی اور جمہوریت

وترقی کی راہ پر گامزن ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ ان کی ذمہ داری کیا ہے؟ اس سوال کا بنیادی جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کا رویہ، جب کہ وہ اس ملک میں ایسی اقلیت میں ہیں جس کا اکثریت کے مقابلہ میں تناسب تقریباً ۱/۵ کا ہے، بڑے حزم وعزم کا ہونا چاہئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ معاملات کو سلجھانے اور حالات کا مقابلہ کرنے میں سوجھ بوجھ اور اسی کے ساتھ عزم وہمت کو اپنا وطیرہ بنانا، حزم یہ ہے کہ حالات کا بروقت جائزہ لینا اور پھر اس کے تقاضہ کے مطابق طریقۂ کار طے کرنا، اور عزم کا مطلب ہے کہ جو تدابیر موقع ومحل کے مطابق معلوم ہوں ان کو ہمت وعزیمت کے ساتھ بروئے کار لانا، یہی دو جہتیں ہیں جن میں مسلمانوں سے کوتاہی ہوتی رہی ہے، اور سچی بات یہ ہے کہ مسلمان اس سلسلہ میں عموماً غفلت سے کام لیتے رہے ہیں، ان کے مخالفین منصوبہ بندیاں کر کے اپنی منصوبہ بندیوں کا نفاذ کرتے رہے، اور مسلمان پیش آمدہ صورت حال کو کم اہم سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل نہ ہوتا تو یہ صورت حال مزید پہلے شروع ہوگئی ہوتی، اور بہت سنگین ہوتی۔

ہندو احیائیت کی جو رَو اس وقت نظر آرہی ہے، بلکہ جس پر عمل درآمد ہورہا ہے، اس کا تانا بانا ایک تو سیاسی ہے، اور دوسرا تعلیمی وابلاغی ہے، جہاں تک اس کے سیاسی رخ کا تعلق ہے تو اس کا مقابلہ سیاسی طریقوں ہی سے کیا جاسکتا ہے اور اس ملک میں اس وقت جو سیاسی مزاج حاوی ہے وہ ہے حصول حکومت اور ذاتی پارٹی کو مضبوط بنانے کا، اور اس میں مذہبی انداز کو عموماً اہمیت حاصل نہیں ہے، اس کے معاملات کو مسلمان کہیں اپنے تعاون اور کہیں عدم تعاون کے ذریعہ حل کرسکتے ہیں جیسا کہ عموماً انجام پارہا ہے، اس میں ضرورت پڑنے پر ذمہ داروں سے رابطہ اور افہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کرنا اور انتخابات میں شخص سے زیادہ پارٹی کی اہمیت کو سمجھنا ہے اور

بتقاضائے حکمت عملی مناسب طریقہ اختیار کرنا ہے، اور دوسرا پہلو جو تعلیمی وابلاغی ہے وہ دراصل بہت ہی اہم ہے اس کے لئے مسلمانوں کو اس کے مقابلہ کے لئے ضروری تدابیر اختیار کرنا ہوں گی، اولاً مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرنے کا جو سلسلہ ایک عرصہ سے چل رہا ہے اور جس کو اولاً انگریزوں نے اپنے زمانہ حکومت میں شروع کیا تھا تاکہ مسلمانوں کی ثقافتی واخلاقی برتری کو مٹا سکیں، اس کے ردواصلاح کے لئے مسلمانوں نے کوئی ٹھوس کام نہیں کیا، مسلمان دانشوروں نے مسلمانوں کی تاریخ کو صاف وستھرے انداز میں اپنوں اور غیروں کے سامنے لانے کی تدبیر نہیں کی، کالجوں ویونیورسٹیوں میں غیروں کی تصنیف کی ہوئی کتابیں پڑھائی جاتی رہیں بلکہ مسلمانوں کی طرف سے چلائے جانے والے کالجوں میں بھی وہی پڑھائی جاتی رہیں، اس کی وجہ سے غیر مسلم تو غیر مسلم خود مسلمانوں کے ذہنوں کو بھی ان کتابوں نے مسموم کیا، چنانچہ سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پڑھے ہوئے بہت سے نوجوانوں کے ذہنوں میں بھی مسلمانوں کی پسماندگی اور ابتری کی بڑی وجہ اسلامی تعلیمات اور ان پر عمل کرنا سمجھا جاتا ہے، ان کتابوں میں مسلمانوں کی تاریخ کے واقعات کو عموماً اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ان سے مسلمانوں کی پسماندگی بلکہ تشدد وبربریت کی تصویر سامنے آتی ہے، پھر ہندو احیائیت کے مسلم دشمن داعیوں نے مسلمانوں کی تاریخ کے واقعات کو ہندو دشمنی کا رنگ دیکر مسلم دشمنی کی فضا پیدا کی، اپنے روزمرہ کے تربیتی پروگراموں میں باقاعدہ ان کو مسلم بیزاری کا ذریعہ بنایا، جس کے نتیجہ میں موجودہ صورت حال کا پیدا ہو جانا بالکل مستبعد نہیں تھا، اب بھی وقت گیا نہیں ہے، وہ کام جو ہم کو پہلے سے کرنا چاہئے تھا اس کا ہم اب بھی اہتمام کریں تو حالات کو بہتر بنانے میں ضرور مدد ملے گی، ہمارے دانشور غیر مسلم دانشوروں سے رابطے قائم کریں اور اسلامی طور وطریق وتعلیمات کو حکمت عملی کے ساتھ ان کی صحیح شکل میں ان کے سامنے لائیں،

خواہ یہ سیمیناروں کی صورت میں ہو اور خواہ نجی طریقوں سے ہو، اور اسی کے ساتھ ساتھ ہم اپنی عملی زندگیوں کو اسلام کی دی ہوئی خوبیوں سے مزین کریں، اور غیر مسلموں کے ساتھ اپنے تعلقات میں صحیح اسلامی اخلاق اور خوبیوں کا اظہار ہو تو کم از کم وہ غیر مسلم جن سے مسلمانوں کے تعلقات ہیں، مسلمانوں کو اسلامی خوبیوں کے ساتھ دیکھ کر ان کے ذہن صحیح ہوں گے، پھر ان کے ذریعہ دیگر غیر مسلموں کو مسلمانوں سے جو بدگمانیاں ہیں وہ دور ہوں گی، اور اس ملک میں جہاں مختلف طبقات مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں کے لوگ آباد ہیں یہاں کے سب رہنے والے آپسی تعاون و ہمدردی کے ساتھ ملک کی ترقی اور خوش حالی کو بڑھا سکیں گے۔

اس ملک کے وہ دانشور اور رہنما جو مسلم دشمنی کو فروغ دینے کے لئے منصوبہ بندی کرتے ہیں ان کو بھی سمجھنا چاہئے کہ ان کے مسلم دشمنی کے طریقوں سے یہاں کے باشندوں کے درمیان جو ٹکراؤ ہو رہا ہے، وہ ملک کے لئے بہت مضر ہے اب دنیا سمٹ کر ایک محلّہ بن گئی ہے، کوئی خبر اب پردۂ خفا میں نہیں رہتی، ایک چھوٹے واقعہ سے بھی دنیا کے دوسرے حصوں میں واقفیت حاصل ہو جاتی ہے، اور جمہوریت و آزادی کے اس دور میں ہر طرف سے نکیر و تنقید ہونے لگتی ہے، اور بالآخر ظالم کو اپنے ظلم سے رکنا پڑتا ہے، اور جمہوریت و آزادی کی قدروں کو خواہ ظاہر ہی طور پر ہو، اختیار کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح اب کوئی بڑا فرقہ خواہ کتنا مضبوط ہو، اپنے سے چھوٹے فرقہ کو ختم نہیں کر سکتا، فوجی سیاست کا دور اب ختم ہو چکا ہے، اب صرف جمہوریت اور سیاسی حکمت عملی کا دور ہے اب اسی سے قومی مقاصد کی تکمیل کی جاتی ہے اور مسلمانوں کے متعلق خود مسلمانوں کو اور غیر مسلموں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اب اتنی بڑی تعداد میں اور دنیا کے تمام خطوں میں ہیں کہ ان کو کوئی بڑی سے بڑی طاقت ختم نہیں کر سکتی،

صرف نقصان پہونچا سکتی ہے، تکلیف دے سکتی ہے، زندگی کے کچھ فوائد سے محروم کر سکتی ہے، لیکن ان کو نہ فنا کر سکتی اور نہ ان کو مٹا سکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو مجموعی طور پر قیامت تک باقی رہنے کے لئے پیدا کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ: ﴿وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم، ويعفو عن كثير﴾۔

"کہ تم کو جو مصیبت پہونچتی ہے وہ خود تمہارے ہاتھوں کا کیا ہوا ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت سی باتوں کو معاف بھی کر دیتا ہے۔"

لہذا مسلمانوں کو اپنے اوپر ہونے والے مصائب کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے کہ ان کا اصل سبب ان کی بدعملیاں اور کوتاہیاں ہوتی ہیں، مصیبتوں سے بچنے کا اصل اور بڑا علاج ان بدعملیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے میں ہے، ہم کو اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتے ہوئے بتقاضائے وقت تدابیر اختیار کرنا چاہئے، اور ہمارے غیر مسلم ذمہ داران سیاست وحکومت کو بھی سمجھنا چاہئے کہ ملک کے باشندوں کے درمیان عداوت وٹکراؤ پیدا کرنے سے خود ملک کی ترقی اور خوش حالی کو کس قدر بڑا نقصان پہونچ رہا ہے، اور مزید پہونچے کا امکان ہے۔

❖ ❖ ❖

احکامِ الٰہی کی پابندی اور حسنِ تدبیر مسلمانوں کی سربلندی کا ذریعہ ہے

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ، اسلام اور اس کے معاندین کے درمیان کشمکش سے بھری ہوئی ہے، مسلمانوں کو اس کے نتیجہ میں عروج اور زوال دونوں حالات سے گذرنا پڑا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کو بقا و عزت کا مقام حاصل ہے جو اس کو برابر ملتا رہے گا البتہ وہ آزمائشوں سے بھی گزرتی رہی اور ابھرتی رہی ہے اور یہ سلسلہ بعد میں بھی چل سکتا ہے، لیکن اس کو کلی اور حتمی طور پر زوال کبھی پیش نہیں آیا، یہ کبھی کسی ایک علاقہ میں، کبھی دوسرے علاقہ میں، اور کبھی کسی ایک مدت، کبھی کسی دوسری مدت میں پیش آتا رہا ہے، جس کے اثر سے یہ امت وقتی طور پر سخت حالات سے گزرتی رہی، لیکن اس کے باوجود رواں دواں رہی ہے اور عالمی برادری میں اپنی قابل ذکر جگہ بناتی رہی ہے اور اب موجودہ حالت میں بھی اس کے ابھرنے اور باعزت مقام حاصل کرنے کی پوری توقع ہے، اگر ایسا نہ ہوتا رہا ہوتا تو آج وہ جس تعداد میں اور جن مادی اور معنوی دولتوں سے مالا مال ہے، نہ ہوئی ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اسلام و مسلمانوں کے معاندین کے دلوں میں اس امت سے حسد اور اس سے جذبۂ عداوت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور دنیا کی یہ دیگر قومیں اپنی اپنی جگہ پر اور عالمی پیمانہ

پر بھی مسلمانوں کی اُبھرتی ہوئی حیثیت وعظمت سے برابر پریشانی محسوس کر رہی ہیں اور مسلمانوں کو کمزور کر دینا چاہتی ہیں حالانکہ اسلام مسلمانوں کے دلوں میں انسانی ہمدردی اور سب انسانوں کے ساتھ خیر خواہی کا ایسا انسانی جذبہ جاں گزیں کرا دیتا ہے جو دوسروں کو بلا سبب کسی طرح کا نقصان پہنچانے سے ان کو باز رکھتا ہے، مزید یہ بات بھی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ نے کسی دیگر مذہب والے کے مذہب کو بالجبر بدلنے سے منع کر رکھا ہے جس کی بنا پر مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار و حالت عروج وقوت میں بھی کسی کو اپنے مذہب کو چھوڑنے اور اسلام اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا، ہاں اسلام یہ ضرور تاکید کرتا ہے کہ مسلمانوں کو خدا کی معرفت اور حق سے جو آگہی ہوئی ہے وہ دوسروں کو بھی بتائیں اور ان تک پہونچائیں، اور اسلام نے ان کو اس بات کی صرف تاکید ہی نہیں کی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات پر نصرت و مدد کا وعدہ بھی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد جب کبھی مسلمانوں سے ہٹی ہے ان کی اس عمل میں کوتاہی اور دین و اخلاق فاضلہ کی پابندی میں کمی کی بنا پر ہٹی ہے، اور چونکہ دین کی نصرت یعنی اللہ تعالیٰ کے حکموں کی پابندی اور دعوت حق ہی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اپنی اسی نصرت کا وعدہ کیا ہے، لہذا مسلمانوں کو جب بھی بحیثیت امت کے زوال و مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تو مذکورہ بالا ہدایت میں کوتاہی کی وجہ سے سامنا کرنا پڑا، اس لئے یہ سمجھنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کی مصیبتوں کی بنیادی وجہ مسلمانوں کی طرف سے احکام الٰہی کی پابندی اور حسن تدبیر میں ہونے والی کوتاہی ہی بنتی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اسلام ان کو یہ بالکل نہیں سکھاتا کہ وہ غیروں کو بلا سبب کوئی تکلیف دیں یا ان کو نقصان پہونچائیں بلکہ ان کے ساتھ اخلاق و رواداری اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور مسلمانوں کا اس پر عام طور پر عمل بھی ہے، مگر افسوس ہے کہ اسلام کے سلسلہ میں اس کے مخالفوں نے یہ مغالطہ پھیلایا ہے کہ وہ جبر وزور

زبردستی کا مذہب ہے اور قرآن مجید کی ان آیات کا حوالہ دینے کی کوشش کی ہے جن میں قرآن مجید کے نزول کے زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ مکہ کے کفار ومشرکین کی طرف سے تیرہ چودہ سال تک مسلسل دشمنی کرتے رہنے اور اس پر ان کے مسلسل صبر کرنے کے بعد بھی ان کے ان دشمنوں کی طرف سے اور حملہ آور ہوکر ان سے باقاعدہ جنگ کرنے پر بالآخر ان کے ظلم کا سخت جواب دینے کا حکم دیا گیا ہے اس میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ کسی ملک کا دشمن اس ملک پر حملہ آور ہو اور جانی و مالی نقصان پہنچائے تو کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس دشمن کو مارو، قرآن مجید کی آیات کو صحیح طور پر نہ پڑھنے اور نہ سمجھنے کی صورت میں اسلام پر تشدد کا غلط الزام لگایا جاتا ہے، قرآن مجید میں صراحتاً یہ حکم بھی آیا ہے کہ دشمن کے ساتھ زیادتی نہ کرو صرف جتنا ظلم اسی نے کیا، اسی حد تک اس سے بدلہ لو، اور یہ بھی آیا ہے کہ کوئی مشرک (کافر) تمہارے پاس آجائے تو اس کو مہمان کی طرح رکھو تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن سکے پھر اس کو امن وحفاظت سے اس کی حفاظت کی جگہ تک پہنچادو، دراصل قرآن مجید کو اس کے صحیح سیاق وسباق کے ساتھ نہ پڑھنے کی وجہ سے اس کے مخالفین اپنی من مانی تفسیر کرتے ہیں، یہ علمی بددیانتی بھی ہے اور حقائق کو بدل کر پیش کرنے کی حرکت بھی ہے، جو بظاہر جان بوجھ کر کی جارہی ہے اس لئے اس پر افسوس ونفرت کا ہی اظہار کیا جاسکتا ہے، اسلام کی تعلیمات کا انسانی بہی خواہی و ہمدردی کا رویہ جو قرآن مجید اور اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے صاف طریقہ سے سامنے آتا ہے اس کو نظر انداز کر دینا، یہ اس کے مخالفین کا بڑا ظلم ہے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ افہام وتفہیم کے مفید وموثر ذرائع کو اختیار کرتے ہوئے ان لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں جو ایسی غلط تشریحات سے متاثر ہوکر غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے متعلق غیروں کے تاثر کو صحیح کریں اس کے لئے ذرائع ابلاغ اور مخلوط

سیمینار و سمپوزیم کے وسائل اختیار کئے جاسکتے ہیں۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کو اپنی زندگیوں کو ان صفات اور اخلاق سے آراستہ بھی کرنا چاہئے جن سے وہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے مستحق ہوں، غلط عادتیں، جاہلانہ رسوم اور بے ضرورت نام و نمود کا شوق اور شہرت پسندی سے گریز کرتے ہوئے ان کو اچھے کردار اور اسلامی اخلاق و سیرت کو اختیار کرنا چاہئے، اور اسی کے ساتھ داعیانہ رویہ بھی اختیار کرنا چاہئے کیونکہ اسی صورت میں اللہ رب العالمین سے ان کو نصرت و خصوصی مدد حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے زوال سے محفوظ رہتے ہوئے وہ عروج و غلبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

انشاء اللہ مسلمان پھر ابھرے گا (۱)

مسلمانوں کی تاریخ عظیم رہی ہے، انہوں نے جو عظمت حاصل کی وہ محض عظمت ہی نہیں تھی، اس کا راز یہ تھا کہ وہ ایک سیدھی سادی اور سچی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔

کائنات کا سارا نظام اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے اور اس کے سامنے چل رہا ہے اللہ جب کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے اسلام کے فیضان کو وجود میں لانے کے لئے ضرورت تھی کہ اس میں کسی چیز کی آمیزش نہ ہو لہذا جس وقت اسلام آیا اس وقت ایک طرف رومی حکومت تھی، جس کی ایک تہذیب، تمدن اور معیار تھا، دوسری طرف ساسانی حکومت تھی، دونوں کے پاس علم، تمدن، تہذیب، عسکری طاقت اور انتظامی صلاحیت تھی، سبھی کچھ تھا، علم وادب میں طاق تھے، طاقتور بھی تھے اور ساری دنیا میں دبدبہ بھی تھا، وہ روس وامریکہ کی طرح سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور قومیں تھیں، ان کے درمیان عرب تھے جو بالکل ان پڑھ تھے، علم سے جو قابلیت اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے اس سے ناواقف تھے، ہاں ایک نیا دین اور ایک نیا پیغام پہنچانے کے لئے جو فطری صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ ان میں تھیں، انقلاب انہوں نے قبول کیا، ان کی ساری ترقی اسلام کے سائے میں ہوئی۔

---

(۱) جامعہ اسلامیہ سلطانپور میں کی گئی تقریر۔

اسلام کا پیغام پہنچانے اور اس کی ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے عربوں نے علم سیکھا اور ڈیڑھ دو سو برس میں دنیا میں سب سے زیادہ علم عربوں کو حاصل ہو گیا، ان کو سائنس کے علوم کی جو واقفیت اور صلاحیت حاصل ہوئی اس کی بدولت وہ دنیا میں منفرد ہو گئے، علم سے ایسے آراستہ ہو گئے کہ دنیا کی ساری قومیں ان سے نیچے ہو گئیں اور ان کے پیچھے ہو گئیں۔

سات سو سال تک مسلمانوں نے بغیر کسی حریف کے علمی زندگی گزاری، چاہے وہ سائنسی میدان میں ہو یا دوسرے علوم میں جوان کی زندگی سے تعلق رکھتے تھے اس میں انہوں نے کمال پیدا کیا، آج بھی میڈیکل اور دیگر سائنس کے بہت سے شعبوں کا علم مسلمانوں کا رہین منت ہے، اس طرح پانچ سو سال تک عرب علمی زندگی میں منفرد اور قائد رہے۔

زوال اس طرح شروع ہوا کہ انہوں (مسلمانوں) نے علم پر توجہ دینا چھوڑ دیا اور سمجھ بیٹھے کہ جو عزت حاصل ہے وہ ہمیشہ رہے گی جب کہ دوسری قوموں نے ترقی کرنا شروع کیا۔

پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کو ہر طرف سے نشانہ بنایا جا رہا ہے، مختلف طریقوں سے ان کی شبیہ کو مسخ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے خاص طور سے ذرائع ابلاغ کو استعمال کر کے اور لٹریچر کے ذریعے مسلمانوں کی شبیہ کو مسخ، ان کی اچھی باتوں کو بری باتیں اور نیکی کو بدی قرار دیا جا رہا ہے، انہیں تخریب پسند کہا جا رہا ہے اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اگر ان کو چھوٹ ملے گی تو دنیا اور انسانیت کو تباہ کر دیں گے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ساری دنیا کی ترقی کا خواہشمند ہے، تباہ کرنا تو دور کی بات ہے اسلام ترقی دینے اور سنوارنے کے لئے آیا ہے جب تک دنیا کی قیادت، طاقت، سطوت اور علم مسلمانوں کے ہاتھ تھا انھوں نے دنیا کو مالا مال کر دیا۔

مسلمان بہت سے ملکوں میں پہنچے جہاں لوگ جانوروں کی طرح زندگی گزارتے تھے، انھیں تہذیب اور انسانیت سے روشناس کرایا، آدمی بننے کا سلیقہ سکھایا، لیکن آج یہ سمجھا جارہا ہے کہ مسلمان بدسلیقہ ہیں، گندے ہیں، جاہل ہیں، بری حرکتوں میں مبتلا ہیں، ایسے دلائل اور ایسی شہادتیں ان کے خلاف دی جارہی ہیں جو قابل تحقیق ہیں۔

الحمد للہ مسلمانوں میں شعور بیدار ہو چکا ہے، وہ زندہ رہنے، باقی رہنے اور اپنی عظمت کو حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان زندہ ہیں اور زندگی کے سبب رواں دواں ہیں، جو راستے پر چلیں گے وہ منزل پر پہنچ جائیں گے، ہر جگہ مسلمانوں کا شعور بیدار ہو چکا ہے، جو اصحاب شعور اور جذبے کے مالک ہیں وہ ماضی کی عزت اور عظمت کے لئے کوشش کررہے ہیں۔

اخبارات اٹھا کر دیکھئے تو انسان کا سینہ چوڑا ہوتا ہے، محنتوں اور صلاحیتوں کے واقعات سامنے آرہے ہیں، نتیجہ کب نکلے گا یہ بات مستقبل کی ہے۔

حوصلہ انقلاب لاتا ہے، ایک عیسائی حکمراں کی بات جس سے حضور کی توہین ہوئی تھی، صلاح الدین ایوبی کے دل کو لگ گئی، سمجھداری اور حکمت سے کام لیا، دنیا بدل گئی، اور بیت المقدس مسلمانوں کو واپس مل گیا، اس دور میں جو خبریں مل رہی ہیں کچھ مشکل نہیں کہ مستقبل شاندار ہو، اور عظمت واپس آئے، ضرورت ہوشیاری اور سمجھداری کی ہے۔

بڑی طاقتیں جن کے ہاتھوں میں دنیا کی باگ ڈور ہے ایسے انتظام کررہی ہیں کہ مسلمان آگے نہ بڑھ سکیں۔

مسلمان اب تک علم میں پیچھے ہیں، تعلیم کا فیصد مسلمانوں میں بہت گرا ہوا ہے، مسلمانوں کا علم سے بہت گہرا تعلق ہے، مگر انھوں نے اس تعلق کو ختم کردیا، مسلمانوں کو گرانے، اور غلط فہمی پیدا کرنے، اور غلط انسان بنا کر پیش کرنے میں لوگ

لگے ہوئے ہیں۔

ملک سیکولر ہے، حکومت مسلمانوں اور اسلام کی سرپرستی نہیں کر رہی ہے، ہم نہ تو مطالبہ کر سکتے ہیں، نہ توقع کرنی ہے اور نہ وہ کریں گے، خاص طور پر تعلیم کے مسئلہ میں۔

گجرات کے زلزلے کو ہی لے لیجئے مادی انداز سے سوچنے والے زلزلے کی وجوہات بتا دیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زلزلہ اللہ کی طرف سے آتا ہے اور یہ قہر خداوندی ہے، اگر باریکی سے جائزہ لیا جائے تو ایسی چیزیں ملیں گی جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہیں، اس لئے کوشش کرنی چاہئے کہ پروردگار ہم سے ناراض نہ ہو۔

تعلیم آدمی کو آدمی بناتی ہے، اس سے صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں، ملک کی طرف سے جو تعلیم دی جارہی ہے وہ ہم کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے والی تعلیم ہے، ضرورت ہے کہ نئی نسلوں کو ایسی تعلیم دلوائیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرسکیں۔

حکومت جو تعلیم دے گی وہ سیکولر ہوگی، اگر شرارت ہوگی تو دوسری تعلیم ہوگی، تھوڑی بہت کوشش کرکے کم سے کم ایسی بنیادی تعلیم دیدی جائے کہ دین تو باقی رہے، اللہ ورسول کو تو پہچانتے رہیں، نئی نسل جانے گی نہیں تو کیسے سیکھے گی، تعلیم کی فکر کرنی چاہئے، جب تک ہم اس کی فکر نہیں کریں گے ترقی نہیں کر سکتے، تعلیم یافتہ تو ہو جائیں گے، لیکن مسلمان نہیں رہیں گے، مسلمان مسلمان نہیں رہے گا تو امت ہی ختم ہو جائے گی، اس وقت میڈیا پر یہودیوں کا قبضہ ہے، اقتصادیات پر یہودیوں کا قبضہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی لڑکے علم کے پیچھے پاگل ہو رہے ہیں۔

ہم اردو زبان کو سنبھال نہیں سکتے، جو نسلیں فکر کرتی ہیں وہ طاقتور ہوتی ہیں، جو کوتاہی ہے وہ ہماری کوتاہی ہے، اردو تعلیم کی خاص طور سے فکر کرنی ہے تاکہ ہمارے متعلق درست رائے قائم ہو، اسلام کی طرف سے عورتوں کی تعلیم کی بہت اہمیت بتائی گئی ہے۔

ذرائع ابلاغ اور لٹریچر کی بڑی اہمیت اور ضرورت ہے، اس میں مسلمانوں نے بڑی غفلت کی ہے۔

ذرائع ابلاغ نے مسلمانوں کو کمتر اور ذلیل کر کے پیش کیا، مسلمانوں کے عقائد اور افکار پر اٹیک کیا گیا ہے، مثال کے طور پر ایک مصنف نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب بہت اچھے انداز میں لکھی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ آپ نے جو کچھ کیا ایک اچھے لیڈر کی طرح عربوں کی معاشرتی حالت دور کرنے کے لئے کیا، اور جو آپ کی عظمت کے واقعات ہیں وہ ایک بہترین لیڈر کی حیثیت سے آپکی کوشش کی وجہ سے ہیں، اس طرح وہ نبوت کی خصوصیت ختم کرنا چاہتا ہے، پڑھنے والا گمراہ ہوگا اور سمجھے گا کہ آپ کی تعریف ہو رہی ہے، جبکہ آپ نبی تھے جو اللہ کا مقرر کردہ ہوتا ہے، جب کہ لیڈر افراد بناتے ہیں، اسطرح اسلام کی شبیہ کو بگاڑا جارہا ہے۔

ہندوستان کے اخبارات میں مسلمانوں کی شرافت، عزت اور عظمت نیز جو مسلمانوں کی اچھی چیزیں ہیں ان کو دبا کر رکھا جاتا ہے، جو نقائص ہیں ان کو اچھالا جاتا ہے۔

کلکتہ میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں سات لاکھ افراد اکھٹا ہوئے، ایک انگریزی اخبار میں خبر آئی کہ چند سو مسلمان جمع ہوئے، یہ طریقہ بہت سمجھداری سے اختیار کیا جارہا ہے۔

ذرائع ابلاغ سے ہمارے متعلق لوگ صحیح بات نہیں سمجھ سکتے، اقتصادیات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ذہنوں کو بدل دیا گیا ہے، وہ سمجھتے ہیں ہر مسلمان جیب میں چاقو رکھتا ہے اور مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ دوسروں کو ذبح کرتا ہے۔

ہمارے پاس ذرائع ابلاغ نہیں، ہم وہ لٹریچر نہیں پیدا کر پا رہے ہیں جس سے دوسروں کو سمجھا سکیں اور اسلام کی خوبیوں کو سامنے لاسکیں، پڑوسیوں

اور غیر مسلموں میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو سن کر حیرت ہوتی ہے، ذرائع ابلاغ کے ذریعے غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں۔

مسلمان اپنے کو اللہ کی مرضی کے تابع بنائیں، فرشتوں نے اللہ سے کہا کہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں بتایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نہ کہتے تھے کہ ہم اپنا خلیفہ بنائیں گے اور اسے علم وشعور عطا کریں گے، اس لئے نائب کی حیثیت سے ہم دنیا میں اس طرح زندگی گزاریں جیسی اللہ چاہتا ہے، جو اصل انتظام والی ہستی چاہتی ہے، نائب اسی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے۔

اللہ انسانوں کی بھلائی چاہتا ہے، ان کی فلاح وترقی چاہتا ہے، لیکن اس کے بتائے ہوئے طریقے اختیار کرنے کے بعد، مسلمانوں نے جب اس بات کو سمجھا اور اختیار کیا تو علم سے فائدہ اٹھایا اور بام عروج پر پہنچ گئے، اللہ چاہئے گا تو مسلمان پھر ابھرے گا۔

اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک اس کو خود فکر نہ ہو، لوگوں میں شعور بیدار ہو رہا ہے، وہ کوشاں ہیں ملت کے لئے دین کے لئے، مسلمانوں کے وقار کے لئے، دینداری امت کو اب تک زندہ رکھے ہوئے ہے، پروردگار ہم سے ناراض نہ ہو، اس کو راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، ہماری نسل تو رخصت ہو رہی ہے نئی نسل کی فکر کرنی ہے۔

❖ ❖ ❖

مذہب اسلام کے ماننے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا

دین حق کے پیغام کے پہونچانے میں آپ نے جبر واکراہ کی اجازت نہیں دی، صرف پیغام حق پہونچانے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے مقابلہ میں ضرورت پڑنے پر ہی طاقت کے استعمال کی تلقین کی اور اس کو جہاد قرار دیا اور حکم دیا کہ اس میں اپنے نفس کی خواہش یا کسی دنیاوی منفعت کو سبب نہ بننے دیا جائے ورنہ جہاد کی فضیلت حاصل نہ ہوگی، جہاد صرف اللہ کے حکم کی تعمیل میں یا اپنے جائز دفاع ہی میں صحیح قرار دیا، اسی طریقہ اور اصول پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء نے عمل کیا، جس کے نتیجہ میں ایران وروم، مصر وسوڈان وحبشہ اور دوسرے علاقے بالآخر اس پیغام حق کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور اسلام کی دعوت توحید واطاعت کو کھلے دل سے سمجھنے کے بعد ارد گرد کے سارے علاقوں کے باشندے بخوشی اور بطمانینت قلب اس کے سایہ میں آگئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پچاس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ دنیا کا سارا متمدن وباشعور علاقہ اسلام کے عقیدہ ودین کا تابعدار بن چکا تھا، اگر چہ اس سلسلہ میں مخالفین سے کئی جنگیں کرنی پڑیں، لیکن یہ جنگیں زور دستی دکھانے اور اپنے قبضہ کو پھیلانے کے جذبہ سے

خالی تھیں، ان کا صرف یہ جذبہ تھا کہ حق کے پیغام کو پہونچانے میں جو رکاوٹ پیدا کرے اور مقابلہ پر آئے اس سے طاقت آزمائی کی جائے، اسی طرح اسلام پر عمل کرنے والوں پر ظلم وتعدی کیا جارہا ہو، اس کو دور کرنے کے لئے حسب ضرورت طاقت کا استعمال کیا جائے اور جس کا حکم قرآن میں اس طرح آیا ہے کہ:

﴿مالکم لا تقاتلون فی سبیل الله و المستضعفین من الرجال و النساء و الولدان الذین یقولون ربنا أخرجنا من هذه القریة الظالم أهلها، و اجعل لنا من لدنك ولیا، و اجعل لنا من لدنك نصیرا﴾ (سورۃ النساء:۷۵)

"تم کیوں نہیں اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے جب کہ وہ مرد عورتیں اور لڑکے جنھیں کمزور سمجھ کر دبا کر رکھا گیا ہے کہ کہہ رہے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے نکال، جس کے رہنے والے ظلم وزیادتی کرنے والے ہیں اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ہمدرد اور ساتھی بنا اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے مددگار بنا۔"

ان کوششوں کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ اللہ کا بھیجا ہوا مکمل ضابطۂ حیات اور احکام شریعت لوگوں تک پہونچایا جاسکے تا کہ حجت پوری کی جاسکے، اور امت وسط اپنی ذمہ داری پوری کرسکے اور قیامت کے روز گواہی دے سکے کہ سب قوموں پر حجت پوری کی جاچکی تھی اور سارے انسانوں کے لئے دین حق کو جاننے اور سمجھنے کا وسیلہ مہیا کیا جاچکا تھا اور اب وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو دین حق جاننے کا موقع فراہم نہیں ہوا تھا، دین حق کو ہر طرف پہنچانے کے ذرائع اس امت کے رہنماؤں نے ہر طرح کے اختیار کیے، تعلیم کے راستہ سے، نصیحت وتربیت کے راستہ سے، اپنی پاکیزہ زندگیوں کے نمونے سامنے لاکر اور دین حق کے جاننے کا ماحول مہیا کرکے اور آخر میں مزاحمت

کرنے والوں اور مزاحمت کے لئے طاقت استعمال کرنے والوں سے اسی طاقت اور مزاحمت کے ساتھ نبرد آزمائی کر کے تاکہ دین حق پر عمل کرنے والوں کے راستہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو روکا جاسکے اور حق کی بات سننے کی راہ ہموار کی جاسکے۔

راہ دعوت میں دشواریوں کا مقابلہ اور صبر و ہمت

اس سلسلہ میں امت مسلمہ کے افراد نے ضرورت کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری کی، جس کے راستہ میں ان کو سخت مزاحمتیں بھی پیش آئیں، اور مکر و فریب کے حملوں سے بھی سابقہ پڑا، اور ظلم و دھاندلی کا بھی سامنا ہوا، جس کے واقعات پوری تاریخ اسلامی میں پھیلے ہوئے ہیں، اور یہ حملے خاص طور پر یہود و نصاریٰ کے حلقوں سے کئے جاتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں امت مسلمہ کو نقصانات بھی ہوئے، اور مخالفانہ کوششوں اور سازشوں سے بہت سے ہدایت یافتہ انسان راستہ سے بھٹکے بھی، اور اس وقت بھی یہ صورتحال دنیا کے مختلف علاقوں میں جاری ہے، لیکن دین حق کے پہونچانے کا کام کرنے والے بھی صبر و ہمت سے اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور ان کو کامیابیاں بھی حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

امت کی اہم خصوصیت توسط و اعتدال

اس امت کی تین اہم خصوصیات بتائی گئی ہیں، ان میں سے دو خصوصیات اس کا کمال اور اس کی برتری ہے اور تیسری خصوصیت اس کا اعتدال و توسط ہے، جیسا کہ اوپر کے بیان میں گزر چکا، اس امت کا توسط و اعتدال اس کے طریقۂ کار اور خصوصیات میں ہر جگہ پوری طرح نمایاں رہا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے لے کر اس امت کی تاریخ کے مختلف ادوار میں جن شخصیتوں نے اپنے اہم کردار کا ثبوت دیا ان سب میں توسط و اعتدال کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ان میں نہ تو افراط رہا

کہ بالکل رہبانیت اختیار کرلیں اور نہ تفریط رہی کہ دین ودنیا کے مباح وضروری امور کونظر انداز کر دیں، بلکہ عبادات ہوں یا زندگی کے دیگر معاملات سب میں کامل اعتدال اختیار کرتے تھے۔

اس امت میں جو شخصیتیں مختلف زمانوں میں ابھریں اور بلند مقام کی مستحق ہوئیں ان میں ذوق عبادت اور تقویٰ اپنے پورے معیار کے مطابق پایا گیا ہے، لیکن اس طرح تھا کہ زندگی کے جائز تقاضوں سے ان کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا تھا، اور عزیمت ومجاہدہ کی صفت کسی میں ظاہر ہوتی تو صرف ایک پہلو میں نہیں بلکہ مختلف پہلوؤں میں ظاہر ہوتی کہ ایک طرف عبادت میں کمال ہے تو دوسری طرف لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں پوری محبت و ہمدردی اور تیسری طرف حسب ضرورت عمل و جہاد میں بھی شرکت، ان معیاری انسانون کے متعلق صحیح کہا گیا کہ: "رهبانا بالليل وفرسانا بالنهار" کہ رات میں دیکھو تو تارک الدنیا انسانوں کی طرح عبادت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، اور دن میں دیکھو تو میدان زندگی کے شہ سوار اور فریضہ جہاد میں مشغول، معاصی سے سخت پرہیز کرنے والے اور اعتدال سے کام لینے والے ہوتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال وتوسط کی ترغیب دیتے ہوئے خود اپنی مثال دی، فرمایا کہ میں رات کو عبادت میں جاگتا ہوں، اور آرام کے لئے سوتا بھی ہوں، روزے رکھتے ہوئے بھی دن گزارتا ہوں اور بغیر روزہ کے بھی دن گذارتا ہوں اور ازدواجی زندگی بھی اختیار کیے ہوئے ہوں پھر بھی تم سب سے زیادہ اللہ کا عبادت گزار بندہ ہوں، اور آپؐ نے تلقین فرمائی کہ "خير الأمور أوسطها" بہتر باتیں وہ ہیں جو درمیانی ہیں، یعنی وہ باتیں جن میں نہ غلو سے کام لیا گیا ہو نہ کوتاہی سے کام لیا گیا ہو، اور وسطیت کے جو معنی بتائے گئے ہیں ان میں یہ خاص پہلو ہے کہ ضرورت واہمیت کے لحاظ سے اور اسی کے مقدار کے مطابق عمل ہو، یہی وسطیت اور درمیانی طریقۂ عمل ہے۔

آپ کی مکی اور مدنی زندگی کا الگ الگ طریقۂ کار

انہی معنوں میں یہ بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی مکی زندگی میں صرف صبر و برداشت اور قربانیوں سے کام لیا گیا، اور حق کے حاملین نے صرف برداشت کیا، مقابلہ نہیں کیا، اور یہ سلسلہ تیرہ سال تک رہا، وہاں نرمی کے ساتھ دعوت اور تربیت اخلاق کے طریقہ پر اکتفاء کی گئی، اور مدینہ کی زندگی میں دس سال کو ان حضرات نے نظم و انتظام اور دشمن سے نبرد آزمائی اور دعوت کو دور تک پھیلانے کی کوشش میں گزارا، اور آپؐ نے اپنے اصحابؓ سے انہی طریقوں پر عمل کرایا، اس طرح مکہ کی زندگی میں ہر طرح کی برداشت اور صبر و ہمت کی مشق بھی ہو گئی اور حالات اور مقامی تقاضوں کے مطابق حکمت عملی پر بھی عمل کیا گیا، اور مدینہ کی زندگی دشمن کے مکر و فریب اور دھمکیوں کا منھ توڑ جواب دینے اور حسب ضرورت بہادری دکھانے میں صرف ہوئی، اس طرح مسلمانوں کے طبقۂ اول نے جو طرز اپنایا وہ تمام طبقات کے لئے نمونہ ہے، اسی جامعیت اور وقت اور جگہ کے تقاضہ کے مطابق صبر و برداشت اور جرأت و ہمت دونوں طرح کے طرز پر عمل کرتے ہوئے گزاری، کہ نہ اس میں افراط تھا نہ تفریط، بلکہ توازن اور توسط تھا، اسی کے ساتھ عملی اخلاق اور انفرادی زندگی میں احتیاط و تقویٰ، عمل صالح کی تلقین، معاشرہ کے اندر آپس کی خیر خواہی، کمزوروں کی مدد، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، مصیبت زدگان کی مدد، مریضوں کی عیادت اور ہمدردی، ایک دوسرے کے ساتھ انکساری، آپس میں محبت، اخلاص و مروت، دشمنوں کے ساتھ جرأت حق کے خلاف کام کرنے والوں سے سختی، حق کی حمایت میں عزم و ہمت، انسانوں کی ہمدردی میں دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح جیسی صفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ حضرات میں ملتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے انھیں باتوں کی اپنی امت کو تلقین فرمائی اور ان پر اپنے ساتھیوں کو عمل کرنے کی عادت ڈلوائی، اور اس طرح ان اوصاف کو اپنے بعد آنے والے افرادامت کے لئے دین واخلاق کا اسوہ ونمونہ بنا دیا، جو بعد میں آنے والے منتخب مسلمان دینی رہنماؤں میں عموماً پائے جاتے رہے، اوران کا یہ طرۂ امتیاز رہا، اور یہی کردار قوموں کی رہنمائی اوران کی نگرانی کے کام میں ان کا طرز عمل رہا۔

امت اسلامیہ کی عظیم ترین ذمہ داری

قوموں کی اصلاح کی فکراور دین حق کی طرف ان کو مائل کرنے کی کوشش اس امت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿والذین کفروا بعضهم أولياء بعض إلا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد كبير﴾۔ (سورۃ لأ نفال:۷۳)

"یعنی حق سے انکار کرنے والے ایک دوسرے کے متعاون اور دوست ہیں، تم نے اگر اپنا کام نہیں کیا تو زمین پر بہکانے کا اور برائی کے لئے لبھانے کا ایک سلسلہ ہوگا، اور بڑا بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔"

اس لئے ساری دنیا کی اصلاح اور درستگی کی کوشش ان مسلمانوں کی ذمہ داری بنا دی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس عمل کے سلسلہ میں دنیا کے مختلف حصوں سے ان کا رابطہ قائم ہو جانے کے بعد وہ دین واخلاق کے تعلق سے ساری دنیا کے عمل اور ردعمل سے واقف ہو رہے ہیں، اور اسی بنا پر وہ ان کے بارے میں قیامت کے روز صحیح گواہی دینے والے ثابت ہوں گے، ان کی یہ امتیازی شان جو اللہ کی طرف سے ان کو دی گئی ہے اور اس کی وسطیت سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کے لئے محض تمغۂ امتیاز نہیں، بلکہ یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے، ان کی یہ عظیم ذمہ داری جس میں تمام انسانوں

کی خیر خواہی اور ان کے متعلق عند اللہ گواہی کا فریضہ ادا کرنا ہے۔

ایمان وعمل صالح کا اعلیٰ کردار

اس کام کے لئے خود اس امت کو اپنا کردار اسی معیار کا بنانا ضروری رہا، جو اس بلند مقام کے لائق قرار پاسکے، اس لئے جہاں یہ ذکر ہے کہ تم اچھی باتوں کی ہدایت کرتے ہو اور بری باتوں سے منع کرتے ہو وہاں یہ ذکر بھی آیا "وتؤمنون باللّٰہ" کہ تم حق کو دل سے مانتے ہوئے ایمانی زندگی اختیار کرتے ہو۔

فرض منصبی کی ادائیگی کا شاندار کردار

اس امت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس امت میں مسلسل اور اس کے مختلف علاقوں میں ایسی ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں کہ جو ایمان وعزیمت کے معیاری کردار کی حامل رہی ہیں، اور جب جب انسانی زندگی میں دینی واخلاقی بگاڑ پھیلا ہے اس امت میں سے کوئی شخصیت قدر آور بن کر سامنے آگئی اور ایمان وعزیمت کی خصوصیت کے ساتھ انسانوں کی اخلاقی ومذہبی بلکہ انسانی وفکری رہنمائی واصلاح کا ایسا زبردست کام انجام دیا کہ جس کی مثال صرف نبیوں کے یہاں ملتی ہے، وہ نبی تو نہ تھے کیونکہ نبوت آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے، لیکن انھوں نے اپنے کردار اور سیرت سے نبیوں کا نمونہ پیش کیا، ان کو خدا کی طرف سے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لئے نبیوں کے طریقہ کی توفیق کی دعا کریں اور یہ دعا ان کو سورہ فاتحہ میں پڑھنا بتایا گیا ہے جو نمازوں کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے کہ اے اللہ ہم کو سیدھی راہ عطا فرما، ایسی راہ جو ان لوگوں کی ہے جن پر تیرا انعام ہوا، اور ایک جگہ یہ دعا بتائی گئی "واجعلنا للمتقين إماما" کہ ہم کو پرہیزگاروں کا امام ومقتدی بنا۔

چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پھر ان کے بعد متعدد تابعین، پھر تبع تابعین،

جن میں نمایاں طور پر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، پھر بعد کے لوگوں میں ائمہ حدیث وائمہ فقہ، ائمہ تزکیہ وتصوف، عظیم غازی ومجاہد جنھوں نے اسلام کے صحیح اصول اور مسلک کے مطابق جہاد کی مثالیں قائم کیں، خدمت علم کے میدان کے عظیم شہسوار اور اس طرح کی دوسری عظیم تاریخی شخصیتیں گذشتہ تاریخ اسلام میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

تبلیغ دین ودعوت حق عالمی سطح پر

امت کے ان کارگزاروں نے خدائے واحد کی بندگی اور اس کی بھیجی ہوئی شریعت کے پیغام کو دور دور تک پہونچایا، انسانی آبادی کا کوئی اہم علاقہ ایسا نہیں بچا جہاں ان میں سے کسی نہ کسی کے قدم نہ پہونچے ہوں اور جہاں یہ کہنے کا موقع رہ گیا ہو کہ ہم تک کوئی پیغام نہیں لایا، اور ہمارے یہاں کوئی بتانے والا نہیں پہونچا، اس امت کی یہ ذمہ داری ان پر رکھی گئی کہ اپنے کو اس پیغام خداوندی پر عمل کے مطابق ڈھالتے ہوئے دوسروں تک وہ پیغام پہونچائیں، اور اس پر نظر رکھیں کہ لوگوں نے کہاں تک مانا، یہی منصب اور کام قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر ہے کہ:

﴿ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر وأولئك هم المفلحون﴾ (آل عمران: ۱۰۴)

”کہ تم میں ایک جماعت (امت) ایسی ضرور رہنی چاہئے جو اچھائیوں کا حکم دے اور برائی سے منع کرے، اور یہی لوگ اصل کامیابی والے ہیں۔“

اس آیت میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ امت کے معتد بہ افراد اگر اس ذمہ داری کو انجام دے رہے ہیں تو وہ فریضہ انجام پا رہا ہے اور یہ فریضہ انجام دینے والے ہی لوگ کامیاب ہیں، اور یہ فطری بات بھی ہے کہ امت کے ہر ہر فرد پر

ذمہ داری نہ ہو کیونکہ امت کے ہر فرد میں بشری وجسمانی صلاحیتوں میں کمی رہنے کی وجہ سے اس عظیم کام کی لیاقت کا ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن ایک خاص تعداد میں ایسے لوگوں کا ہونا ضروری ہے، تاکہ ہر کام انجام پائے، ظاہر ہے کہ یہی لوگ نمایاں لوگ قرار پائیں گے، ہمیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ ہی سے اس کی مثالیں ملتی ہیں، انھوں نے جہاں صرف محبت اور حسن اخلاق سے یہ کام انجام پاتا دیکھا وہاں اس طرح انجام دیا، اور جہاں ہمت وجرأت اور دفاع کی ضرورت پڑی وہاں اس طرح کیا، مختلف علاقوں میں ان کو جو فوج کشی کرنی پڑی، وہ برائے جنگ و برائے قتل نہیں تھی، بلکہ اولاً ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پھر ان کی طرف سے تمام اہم علاقوں کی طرف پیام حق بھیجا گیا جو ان کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط کی شکل میں تھا، ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد کے اہم علاقوں کے سربراہوں کو دعوت دی کہ وہ خدا کی بندگی اور اس کے دیئے ہوئے صحیح راستہ کو اختیار کریں اور اس کی دعوت کو قبول کریں، اور قبول نہ کرنا چاہیں تو اس پیغام کو عوام تک پہونچانے میں رکاوٹ نہ ڈالیں، تاکہ حق بات لوگوں تک پہونچ سکے، پھر ان کی مرضی پر منحصر ہے مانیں یا نہ مانیں، کوئی زبردستی نہیں، کیونکہ اسلام میں مذہب کو زبردستی منوانا منع ہے، اگر حق بات پہونچانے سے روکا جائے تو پھر مسلمانوں کو سخت معاملہ کرنے کا حکم ہے، چنانچہ صحابہ کرامؓ نے ان نہ ماننے والوں کے علاقوں کی طرف مجاہدوں کی جماعتیں بھیجیں کہ وہ ان کو دو باتوں میں ایک بات قبول کرنے پر آمادہ کریں۔

جہاد کی ضرورت اور اس کے اسباب

البتہ ان میں سے جو دونوں باتوں کو نہ مانے، اور دین حق کے داعیوں کی پرامن کوشش میں رکاوٹ ڈالے، اور پیغام حق کو قبول کر لینے والوں کو پریشان کرے

اور حق پر عمل نہ کرنے دے اور ان کا طاقت وزور دستی سے مقابلہ کرے تو ان سے اہل حق کو مقابلہ کر کے مذکورہ دو پُر امن باتوں میں سے کسی ایک پر مجبور کیا جائے گا یعنی وہ یا تو حق کو قبول کرلیں اور یا حق کے پیغام میں رکاوٹ نہ ڈالیں اگر دونوں میں سے کوئی بات نہ مانیں گے تو ان سے جہاد کیا جائے گا اور ایک بھی بات مان لیں گے تو ان سے کوئی لڑائی نہیں، یہی وہ اصول اور طریقہ ہے جس کے مطابق جنگ کرنے کو اصلاً جہاد کہتے ہیں اور یہ امیر کے تحت کیا جاتا ہے جس کا انتخاب اسلامی طریقہ سے کیا جاتا ہے، جہاد کے دائرے میں بعض دوسری شکلیں مثلاً ظلم کو دور کرنے، اپنے اوپر حملہ کو پسپا کرنے کو بھی شامل کیا گیا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اپنی خواہش یا محض ذاتی عداوت کی بنا پر نہیں، بلکہ محض اللہ کے لئے جنگ کرنا ہوتا ہے اس میں جان و مال کی قربانی دینا ہوتی ہے، اور اسلامی اصطلاح میں اللہ کے حکم اور اس کی رضا کے لئے جو جدو جہد کی جائے خواہ پُر امن ہو اور خواہ جنگ کی صورت میں ہو، جہاد کے زمرے میں شمار ہوتی ہے، دراصل دعوت اور اصلاح حال اور خدائے واحد کی بندگی اختیار کرنے کے لئے اور اس کے تقاضے کے مطابق جدو جہد مقصود ہوتی ہے، چنانچہ جنگ بھی اس مقصد کے حصول کے لئے اور پرامن ذرائع کے ناکام ہو جانے کی صورت میں رکھی گئی ہے، اور مسلمانوں نے ہمیشہ اس کی پابندی کی ہے، بلکہ اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ جہاد کی مذکورہ بالا شرطوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے میں کوتاہی ہو جانے پر مسلمانوں کے امیر نے مفتوحہ علاقہ کو خالی کر دینے کا حکم دیدیا، اور مسلمان فوجیں مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر واپس آگئیں اور علاقے کو اس کے پہلے حاکموں کے حوالہ کر دیا، اور پھر وہ دو پرامن صورتیں دوبارہ ان کے سامنے رکھیں، اس کا اثر یہ پڑا کہ انھوں نے بخوشی دو صورتوں میں سے ایک صورت قبول کر لی اور جنگ کی نوبت نہیں آئی، اور ایسا واقعہ بھی پیش آیا کہ جہاد کی نوبت آنے پر فتح کردہ علاقے کے

سابق حاکم نے یہ کہا کہ ہم خدائے واحد کی بندگی اور اس کے مطابق زندگی اختیار کرنے کا خود انتظام کریں گے، تو ان کو فاتح نے حکومت واپس کردی اور علاقہ چھوڑ کر واپس آگئے اور یہ کہا کہ ہمارا مقصد اصلاً خود حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے، وہ تم کرو یا ہم کریں، برابر ہے تم ہی کرو، لیکن تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وقتاً فوقتاً مختلف مسلمان حاکموں نے اسلام کے مقرر کردہ اصول سے ہٹ کر اپنی ذات کے لئے اور اقتدار کی خواہش میں جنگ کی، اللہ کے دین کے قائم کرنے اور اس کے لئے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق نہیں کی، ایسی جنگ جہاد نہیں ہے خواہ اس کو جہاد کا نام دیا گیا ہو، اسلامی شریعت میں جہاد وہ جنگ ہے جو اسلامی اصول کے مطابق اور اپنی خواہش کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے لڑی جائے، ایسی جنگ جو اسلام کے مقررہ اصول کے مطابق اور خدا کے لئے نہ لڑی جائے تو وہ جس مقصد کے لئے لڑی جاتی ہے اسی مقصد کے لئے کہلائے گی، اسلام میں غلبہ وفتح حاصل کرنے کا مقصد قرآن مجید کی رو سے اس طرح بتایا گیا ہے:

﴿الذين إن مكنا هم فى الأرض أقامو الصلاة و آتوا الزكاة وامروا بالمعروف ونهو عن المنكر ولله عاقبة الأمور﴾ (سورہ الحج:۴۱)

”کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین پر اقتدار دیدیں تو نماز کے عمل کو قائم کریں گے اور (غریبوں کی مالی مدد) زکوٰۃ دیں گے اور نیکیوں کی دعوت دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے اور تمام معاملات کے نتائج خدا کے ہاتھ میں ہیں۔“

جہاں تک جنگ کے عمل کا تعلق ہے تو وہ انسانوں کا ایک ایسا عمل ہے جو نیتوں اور مقاصد کے فرق کے لحاظ سے دنیا میں مختلف مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے، اور عموماً اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے کیا جاتا ہے لہذا جب وہ کسی اعلیٰ فرض کی ادائیگی کے لئے کیا جاتا ہے تو حقیقت حال سے ناواقف لوگوں کی نظر میں جنگ کرنے والے

کی جاہ طلبی اور ذاتی اغراض کے لئے اقتدار طلبی ہی سمجھا جاتا ہے خواہ وہ خلوص نیت سے اورانسانیت کے فائدہ کے لئے ہو،لیکن نیتوں کا حال اللہ کو معلوم ہے،اور اللہ کے یہاں نیتوں کے اعتبار ہی سے معاملہ ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ایک سوال کرنے والے کے جواب میں وضاحت کی، جس نے یہ سوال کیا تھا کہ بعض لوگ بہادری دکھانے کے لئے اور بعض لوگ جاہ وسلطنت کے حصول کے لئے جنگ کرتے ہیں ان میں کون سی جنگ اللہ کے راستہ میں ہوگی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو جنگ صرف اس لئے لڑی جائے کہ اللہ کی بات غالب ہو وہی اللہ کے راستے میں شمار کی جائے گی،اس طرح اسلام میں جنگ اسی وقت جہاد بنتی ہے جب وہ اللہ کی بات غالب کرنے کے لئے لڑی جائے اور اس کا شرعی طریقہ وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا، اور اس کے ساتھ جو شخص مظلوم ہو وہ اپنے اوپر ظلم کو روکنے کے لئے ، اور کوئی صاحب حق جس کا حق زبردستی چھینا جارہا ہو اور جس کے ساتھ زیادتی ہوئی وہ اپنی زیادتی کا بدلہ لینا چاہتا ہو، ان سب کو بھی اپنے حق وانصاف کے لئے لڑنا اور مقابلہ کرنا جائز قرار دیا گیا ہے،لیکن صرف اسی مقدار میں جتنی مقدار ضروری ہے۔

اسلام میں جہاد نفس کشی اور قربانی ہے

لیکن اسلام میں جہاد کا عمل جس میں صرف اللہ کے حکم کی تعمیل پیش نظر ہوتی ہے بہادری، فائدہ یا نفس کی خواہش پیش نظر نہیں ہوتی ، یہ ایک مشقت کا کام اور ایک قربانی ہے اور اپنے کو خطرہ میں ڈالنا ہے، یہ الگ بات ہے کہ خطرہ میں ڈالنے کے بعد نتیجہ اچھا نکلے،اور ذاتی فائدہ بھی ہو،لیکن مجاہد اپنے نفس کے فائدہ اور محض دنیاوی غرض کو اپنا مقصد نہیں بنا سکتا، اس طرح اسلام میں جہاد ایک نفس کشی اور ذاتی غرض کی

قربانی کا عمل ہے، اور سب سے مشکل عمل ہے، اسی لئے اس کی بڑی فضیلت بتائی گئی ہے کہ آدمی اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی جذبہ سے نہیں بلکہ صرف اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہا ہے، یہ بڑے ثواب کا عمل قرار دیا گیا ہے، اصل فریضہ انسانیت کی اصلاح ودرستگی کی کوشش ہے، بہر حال خدا کی بندگی اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقہ کو جس کو آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی وحی کی بنیاد پر آخری آسمانی کتاب کے ذریعہ بتایا ہے اس طریقہ کو پہونچانے اور پھیلانے کے لئے کوشش اور جدوجہد کے اس مناسب طریقے پر چلے جو اس کے مورث حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں جاری تھا جس میں صرف ایک خدائے واحد کی بندگی کے علاوہ کسی دوسرے کی بندگی نہ تھی، اس کے ساتھ ساتھ اخلاق وکردار کی درستی اور خدا کی طرف سے وقتاً فوقتاً بھیجے جانے والے نبیوں کی پیروی تھی، یہی دین حق ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل کر دیا گیا، اب قیامت تک انسان کے لئے وہی فلاح کا راستہ رہے گا، اس کو اپنانے اور رواج دینے کی ذمہ داری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر ڈالی گئی ہے، اس طریقۂ حق کو دوسروں تک پہونچانے کے مختلف ذرائع ہیں، ان میں سے ایک ذریعہ علم وابلاغ کا ہے، دوسرا محبت وہمدردی کا ہے، اور تیسرا ذریعہ راہ حق میں رکاوٹ ڈالنے والوں اور روکنے والوں سے مقابلہ کرکے اللہ کی مرضیات کا ان کو تابع بنانے یا مصالحت پر آمادہ کرنے کا ہے۔

مقابلہ کے ذریعہ میں قتال یعنی جنگ بھی آتا ہے اور اصول کے مطابق ہو تو جہاد کہلاتا ہے، حدیث شریف میں مختصر انداز میں اس کا حکم یوں دیا گیا ہے کہ: "من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان" تم میں سے جو کوئی شخص نامناسب اور بری بات دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، ہاتھ سے نہ بدل سکے تو زبان سے کرے (کہہ سن

کر منع کر کے یا سمجھا کر یہ تبدیلی لائے) اور اگر اس ذریعہ سے بھی نہ کر سکتا ہو (اس کو خطرہ ہو اور الٹا اثر پڑتا ہو) تو اپنے دل اور خیال وفکر کا ذریعہ اپنائے (دل سے اس کو برا سمجھے اور اس کے بدلنے کی دل میں خواہش رکھے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے (ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ بری بات کو برا سمجھے اور اس کو بدلنے کی خواہش رکھے)۔

مذہب کے ماننے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا

بہر حال اس امت کے افراد کی یہ ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ وہ حق کو پہونچائیں، اور باطل کو روکیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ: "لا إكراه في الدين" کہ دین حق کو بتانے اور اس کو منوانے میں جبر واکراہ نہیں، لہذا کسی غیر مسلم کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جا سکتا، ہاں جو دین حق کی بات پہونچانے میں رکاوٹ ڈالیں اور زبردستی روکنے والے ہوں تو ان سے مقابلہ کیا جائے گا، اور یہ بات مجبورا قتال (لڑائی) تک پہونچا دیتی ہے، مگر رکاوٹ نہ ڈالنے والے اور مقابلہ نہ کرنے والوں سے جبر وزبردستی نہیں کی جا سکتی، اس کی مثالیں برابر مسلمانوں کی جنگوں کی تاریخ میں ملتی ہیں، جب بھی صلح کی پیش کش دوسری طرف سے ہوئی تو مسلمانوں نے جنگ ترک کر دی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ جو تمام مسلمانوں کے لئے اسوہ اور قابل پیروی زندگی ہے پوری دعوت حق کے کام میں اور حق کی ترویج ونفاذ میں گزری، نبوت کی ذمہ داری ملنے پر ۱۳؍سال تکلیفیں اٹھا کر اور عداوت وایذا رسانی برداشت کر کے یہ کام انجام دیا، پھر مدینہ منورہ ہجرت کر کے کام میں وسعت کی گنجائش دیکھی تو کام کو مزید قوت اور وسعت کے ساتھ انجام دیا، اور پھر اسی طریقہ کو آپ نے اپنی

امت کے لئے طے فرمایا اولاً اپنے قریبی علاقوں میں پیغام پہونچایا، پھر دور کے علاقوں میں پیغام پہونچایا، اردگرد کے حکمرانوں کو خطوط ارسال کئے گئے جن میں فرمایا کہ خدائے واحد کی تابع داری اور دین حق کو قبول کریں، تو اس میں ہی خیر وصلاح ہے اور یہی راہ حق ہے، تو جب ان کی طرف سے انکار بلکہ سخت اور نامناسب جواب آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طاقت کے ساتھ آگے بڑھنے کا اور جہاد کا ارادہ فرمایا، جو احتیاط اور مقررہ شرائط کے ساتھ آپ اور آپ کے خلفاء نے آپ کے بعد جاری رکھا، اس طرح پر جزیرۃ العرب میں اور قرب وجوار کے تمام ممالک میں حق کی آواز پہونچا دینے کی راہ نکالی، جس نے حق کی بات کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے پر رضامندی نہیں ظاہر کی اس پر جبر نہیں کیا، لیکن حق کی آواز کو روکنے والوں سے پوری جنگ کی، اور اس میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی اسی مقصد کے لئے مسلمانوں پر قوموں کے احتساب اور ان کے حالات کا جائزہ لے کر ان کو پیغام پہونچانے اور ان تک حق کی آواز پہونچانے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے، اور ان کو اس پر گواہ بنایا گیا ہے۔

ضروری وسائل وصلاحیت

دین حق کو پہونچانے کے لئے اور امتوں پر گواہ بننے کی ذمہ داری پوری کرنے اور مفوضہ ذمہ داری کے جو تقاضے ہوتے ہیں ان کی صلاحیت کارکردگی حاصل کرنے کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر عائد کی گئی ہے، اس میں ایک تو علمی اور معلوماتی صلاحیت ہے جس کے ذریعہ انسانوں کی اخلاقی وفکری رہنمائی کا کام انجام دے سکے، دوسرے کردار وعمل کے لحاظ سے وہ نمونہ پیش کر سکے جو اس کے امت وسط ہونیکے مقام کے شایان شان ہو اور جس میں خدائے واحد کی بندگی کا معیاری عمل ہو، اور تیسرے انسانی معاشرے میں حق وانصاف اور خیر وصلاح کی قدروں کو رائج کرنے

کی کوشش ہو، چنانچہ ان تینوں حیثیتوں سے امت مسلمہ نے بڑا فریضہ انجام دیا ہے اور بڑی ذمہ داری پوری کی ہے اسی طرح علم کے میدان میں بھی غیر معمولی صلاحیت اور کردار کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ وہ کئی صدی تک دیگر قوموں کی استاد رہی اور بڑی حد تک امت وسط ہونے کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کو پورا کیا۔

❖ ❖ ❖

مسلمانوں کی عظمت وسربلندی دراصل ان کے اسلامی کردار وسیرت سے وابستہ ہے

گذشتہ کئی صدیاں مسلمانان عالم کے حق میں سیاسی ومعاشی لحاظ سے سخت حالات کی صدیاں رہی ہیں، ان میں مشرقی قوموں اور خاص طور پر مسلمانوں کو ایک طرح سے بے چارگی مظلومیت اور مصائب کے حالات سے گزرنا پڑا، انہی حالات میں گذشتہ صدی کا آغاز ہوا جس میں مسلمان ملکوں کو یا جہاں مسلم حکومتیں رہی ہیں جیسے برصغیر ہندوستان کے علاقے ان کے لئے تو یہ دور آزمائشوں کا اور سامراجی طاقتوں کے ظلم وجور کو جھیلنے اور کسی حد تک مقابلہ کرنے میں گذرا، برصغیر میں حالات کا سخت حصہ گذشتہ صدی سے قبل کی صدی میں سامراج سے گلوخلاصی کی انقلابی کوشش کی ناکامی سے شروع ہوا جس میں ہزاروں ہزار علماء کو پھانسی پر چڑھایا گیا اور ان کی جائدادوں کو ضبط کیا گیا اور تمام عالی ہمت افراد کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی، ظلم اور جبر وہمت شکنی کا یہ سلسلہ تقریباً نو دہائیوں تک جاری رہا، جس میں اصلاً ان کی انقلابی کوشش حصول آزادی کی کوشش کی بھرپور سزا دی جارہی تھی، اور تقریباً یہ وہ عہد تھا جس میں دوسری طرف سامراجی ملکوں میں علم وتمدن ترقی پر ترقی کر رہا تھا، اور ان کے اصحاب اپنے وسائل زندگی اور سیاسی اور اقتصادی تفوق کی بنیاد پر مشرقی ممالک کی

قوتوں کا پورا استحصال بھی کر رہے تھے، یہ سلسلہ مشرق میں ملیشیا، انڈونیشیا سے لے کر مغرب میں مراکش تک پھیلا ہوا تھا، چنانچہ ان ممالک کی سامراج گرفتہ قوموں میں سے جو قومیں سر اٹھا سکتی تھیں ان کو ان کے آقاؤں کی طرف سے کچلنے اور آخری حد تک کمزور بنانے کی تدبیریں کی جارہی تھیں اور ترکی جو مسلمانوں کے لئے گذشتہ کئی صدیوں سے طاقت وعظمت کی علامت بنا ہوا تھا، سیاسی اور اقتصادی بے عملی اور اسباب برتری میں کمزوری کا شکار ہو رہا تھا اور اپنی دشمن طاقتوں سے مات کھا رہا تھا، بالآخر گذشتہ صدی صرف ربع گذری تھی کہ اس کی عظمت پارہ پارہ ہوگئی اور وہ مغربی طاقتوں کا دست نگر بن گیا، اس طرح پورے عالم اسلام میں شکست خوردگی اور مایوسی کی کیفیت عام ہوگئی اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مغربی اقتدار کا لایا ہوا نظام تعلیم اپنی پس ماندہ محکوم قوموں کو علم وہنر کے چشموں سے سیراب کرنے کے بہانے اپنے بنائے ہوئے نئے سانچہ میں مشرقی فرزندان قوم کے دماغوں کو ڈھالنے لگا، اور اس نظام تعلیم کی راہ سے بننے والے اکثر افراد مغرب کے پورے تابعدار بنتے بھی گئے اور اس طریقے سے پورے مشرق میں جسمانی غلامی کے ساتھ ذہنی غلامی بھی عام ہوگئی، ایسی صورت میں مشرقی قوموں کا مستقبل بہت مبہم اور اس میں روشنی کی کرن مفقود نظر آنے لگی تھی، لیکن اس احساس مظلومیت وشکست خوردگی اور اپنے شاندار ماضی کی یاد نے امت مسلمہ کے فرزندوں کی ایک تعداد کو جن کے سرخیل علماء دین تھے شمالی افریقہ کے ممالک نیز بلقان کے خطہ اور برصغیر ہندوستان میں مسلم قائدین نے اپنی غیرت ملی کے تحت ممکنہ جدوجہد میں دریغ نہیں کیا اور اپنی قربانیوں سے سامراجی طاقتوں کو ہلا کر رکھ دیا، دوسری طرف مسلمانوں کے عظیم ماضی کی یادیں تھیں جو قوموں کی تاریخ میں عروج وزوال کے قدرتی عمل کے وجود میں آنے کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ کوئی قوم یا ملک کتنی ہی ترقی کر جائے بہرحال ان کی بھی ایک عمر ہوتی ہے اس کے اسباب زوال اپنا کام کرنے لگتے ہیں اس لئے مایوسی کی گنجائش نہ ہونا چاہئے، اور جہاں تک

مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے پاس زندہ اور تابندہ آسمانی کتاب اور محفوظ و رہنمائی کرنے والی مذہبی تعلیمات موجودہ ہیں، چنانچہ انہی کا سہارا لے کر اللہ کے کچھ بندے اپنی کوشش میں لگے ہوئے تھے، انہوں نے دو محاذوں پر محنت اختیار کر رکھی تھی، ایک محاذ سامراجی اقتدار کو ختم کرنے کی جدو جہد کا تھا، اور دوسرا محاذ سامراجی نظام تعلیم کی سامراجیت کا مقابلہ کرنے کے لئے ملت اسلامیہ کی دینی وثقافتی طور پر بقا وحفاظت کے لئے دینی تعلیم کے مراکز قائم کرانے کا تھا، تاکہ ملت کے نوجوانوں کو ذہنی غلامی سے بھی بچایا جا سکے، چنانچہ ان کوششوں اور توجہات سے مختلف جگہوں پر ایسے حالات پیدا ہوئے جن سے مستقبل کی راہ کھلتی گئی اور مسلمانون کی حیات نو کے اشارے ظاہر ہوتے گئے اور گذشتہ صدی مشکل سے نصف گذری ہوگی، کہ یہ مما لک طوق غلامی سے خلاصی حاصل کرنے لگے اور اس کے ساتھ ذہنی وعلمی بیداری میں بھی اضافہ ہوا جس سے اسلامی طاقتوں کو مستقبل کے بہتر ہونے کی اچھی توقع قائم ہوئی، اس کی بنا پر مختلف اہل فکر کہنے لگے کہ اگلی صدی اسلام کی صدی ہوگی اور بعض اہل دانش یہاں تک کہنے لگے کہ ۲۱ ویں صدی مسلمانوں کی صدی ہوگی جس میں سامراجی طاقتوں کا مکمل زوال اور مسلمانوں کا عروج سامنے آئے گا، اور ایسا خیال کرنا کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا کیوں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی رہنمائی میں اور عہد اول کی مثالوں پر عمل کیا جائے تو غیر معمولی تغیر لایا جا سکتا ہے جیسا کہ اسلام کے ظہور کے بعد لایا گیا تھا کہ عرب مسلمان ترقی کر کے ۸ ویں صدی عیسوی اور ۱۴ ویں صدی عیسوی کے درمیان اقتدار اور اجتماعی و تعلیمی زندگی کے ہر میدان میں دوسری قوموں سے آگے اور علوم زندگی اور تحقیق وتدبیر کے معاملات میں فائق رہے تھے، یہ بات ان کو اس صلاحیت اور عمل سے حاصل ہوئی تھی جو کتاب اللہ اور تعلیمات نبوی نے ان کو عطا کی تھی، لیکن بتدریج ان ہی مسلمان ملکوں میں ان تعلیمات کو اپنی زندگی کا دستور بنائے رکھنا اور اسکی رہنمائی میں آگے بڑھنے کا اہتمام کرنا بتدریج کم ہوتا چلا گیا اور ترقی وقوت سے جو

وسائل راحت وعزت اور منافع ان کو حاصل ہوئے تھے، وہ انہی میں مشغول ہوتے چلے گئے، چنانچہ مسلمان من حیث القوم تعلیمات اسلام سے روگردانی اور عالمی میدان عمل میں پست ہمتی اور کمزوری اختیار کرنے پر عروج کے مقام سے گر کر زوال کے مقام تک پہونچ گئے جو آج سے دوصدی قبل پوری طرح عیاں ہوگیا تھا لیکن ان کو یہ بات متحرک بھی کرنے لگی تھی کہ سابق تاریخ کو دوبارہ تازہ کرنے کی کوشش ان کو پھر ان کے سابق مقام عظیم تک رواں دواں کرسکتی ہے اور یہی بات تھی کہ نئی صدی کا استقبال مسلمان ایک اچھی امید کے ساتھ کرنے لگے تھے، لیکن اب جب کہ نئی صدی کا آغاز ہو چکا ہے، ہم عالم اسلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو صورتحال امید کے ساتھ کسی قدر مایوسی کی بھی نظر آتی ہے، امید تو اس بات سے ہے کہ اسلامی فکر کی توضیح اور سر بلندی کے تقاضوں کے تذکرہ پر اچھا خاصا لٹریچر پڑھے لکھے طبقے میں پھیلا ہے اس سے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں کی اسلامی آبیاری ہوتی ہے خاص طور پر نوجوانوں میں اس سے اچھا فکر وحوصلہ اور جذبہ پیدا ہوا ہے اور انہوں نے مسلمانوں کی سر بلندی کے لئے جو کوششیں کیں ان کے بھی اچھے نتائج سامنے آئے جس کے اثر سے جو خاص بات دیکھنے میں آرہی ہے وہ یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے دین اور حمیت دین کے حامل زیادہ تر صرف عمر رسیدہ اور بوڑھے لوگ ہوا کرتے تھے اور مغربی تمدن کے سامنے خود سپردگی اور احساس کمتری زیادہ تر نوجوانوں میں نظر آتی تھی، اب اس کے برعکس دینداری اور اسلام کی حمیت کا جذبہ خاص طور پر نوجوانوں میں اور ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے اور مذہبی لٹریچر اور دین کی ضرورت کے احساس نے مسلمانوں کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک خاصی تعداد کو متاثر کیا ہے، اور مسلمانوں کی عمر رسیدہ نسل میں بھی اس کے اثرات نظر آرہے ہیں، دعوت وسیاست کا کام بھی اچھے پیمانہ پر کیا جارہا ہے اور مسلمانوں میں جوش سا پیدا کردیا ہے جس کو دیکھ کر مغربی اور اسلام دشمن طاقتوں میں بڑی تشویش اور اسلامی بیداری کو روکنے کے لئے بڑی فکر اور توجہ پیدا ہو

گئی ہے اس کو دبانے اور کچلنے کے لئے جگہ جگہ ظلم اور سخت گیری اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے کی بھرپور کوشش کی جانے لگی ہے، لیکن اس نے ایک حد تک اسلام کی حمیت اور جوش کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیا ہے، دوسری طرف مغرب کے دانشور اور اہل سیاست چونکہ اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کے اس دینی جذبہ کو سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ دیگر مختلف تدابیر سے بھی اس کو دبانے اور ختم کرنے کے لئے لگے ہوئے ہیں اور ایسا عمل اقتصادی اور سیاسی دباؤ اور دھوکہ اور فریب سے ذہنوں کو راہ راست سے ہٹانے کی تدبیروں سے کیا جارہا ہے اور اس کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا جارہا ہے کہ اس کو سمجھنا بعض وقت بہت مشکل ہوجاتا ہے انہیں تدابیر میں ایک تدبیر مسلمانوں کے مختلف گروپوں میں جوش پیدا کرکے آپس کا ٹکراؤ پیدا کردینا ہے، ادھر گذشتہ بیس سال میں مسلم ممالک کی کئی آپسی جنگوں میں یہی مقصد کارفرما رہا ہے، اور اب جب کہ پوری دنیا کو تنہا ایک حکومت کے تحت لے آنے کی کوششیں جاری ہیں جس کا سربراہ یہودنواز امریکہ ہے، مسلم دشمنی کے مقاصد کو بڑی تقویت مل جانے کا اندیشہ ہے اس سے بچاؤ کے لئے دو باتوں کی بڑی ضرورت ہے، ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے دینی واسلامی جوش کو اسلام دشمن طاقتوں کے مکارانہ استحصال سے بچایا جائے، اس کے لئے گہری نظر اور حالات وواقعات سے وسیع واقفیت کی ضرورت ہے دوسری بات جس کی شدید ضرورت ہے وہ یہ کہ مغرب کو جن وسائل پر زیادہ قابو حاصل ہے اس میں ایک عسکری اور دوسرے اقتصادی وسائل ہیں، ان پر قابو پانا مسلمان حکومتوں کا کام ہے، اور وہ اس وقت اس سلسلہ میں بالکل ناکارہ ثابت ہورہی ہیں اور بظاہر ابھی جلدی وہ اس پر قابو نہ پاسکیں گی، اس میں مسلم عوام اپنے جذبہ وہمت اور غیرت دینی کے اثر سے کچھ کرسکیں تو وہ الگ بات ہے لیکن اس کا بہت زیادہ نتیجہ خیز ہونا دشواری رکھتا ہے البتہ تعلیم اور ابلاغ ایسا ذریعہ ہے کہ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان اپنی کمزوریوں کو دور کرنا چاہیں اور تفوق پیدا کرنا

چاہیں تو یہ زیادہ دشوار نہیں ہے، ضرورت ہے کہ ہم علمی وفکری میدان میں تفوق پیدا کریں اور اس کی صلاحیت اپنے عوام میں عام کریں جس کے ذریعہ ہم طاقت واثر کے بہت سے وسائل پر قابو پا سکیں گے، اپنے مخالفین کی رائے پر اثر انداز ہو سکیں گے اور اسلام کے پیغام اور اس کی انسانیت نوازی وحق پرستی کو ان کے ذہنوں میں بٹھا سکیں گے اور اس طرح ہم اگر اپنے مخالفین کے دانشور طبقہ کو متاثر کر سکیں گے تو یہ ہماری بڑی جیت ہوگی کیونکہ قوموں اور ملکوں کی قیادت دانشور طبقہ ہی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ابلاغی وسائل کو ہم اپنے قابو میں لا سکیں یا متوازی ذریعہ ابلاغ جو عالمی سطح پر اثر ڈال سکتا ہو اس میں امتیاز پیدا کر سکیں تو ہمارے دشمنوں کی طرف سے حقائق کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کے چہرہ کو بگاڑنے کی جو سازش بڑے پیمانہ پر چل رہی ہے اس سازش کو ہم ناکام بنا سکتے ہیں، اس طریقہ سے ہم رائے عامہ جو موجودہ دور میں بڑی غیر معمولی طاقت سمجھی جاتی ہے اس کو ہم اپنا معاون اور ہمدرد بنا سکتے ہیں، لیکن یہ باتیں ایسی ہیں کہ ہم کو جذباتیت سے بلند ہو کر حکمت کے ساتھ اور وسیع طریقہ سے اپنانا ہوگا، اور افسوس کی بات ہے کہ اس میں بڑی کوتاہی ہوئی ہے اور اس کوتاہی کا سلسلہ جاری ہے اور ہم اس کوتاہی کو دور کرنے کی طرف ویسی توجہ نہیں دے رہے ہیں جیسی دینا چاہئے، اس لئے ہم کو اس طرف خصوصی توجہ کرنا ہے۔

مسئلہ اس وقت بہت سنگین بن جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علمی وابلاغی محاذ پر مخالفین اسلام سرگرم ہیں، اور ہماری طرف سے اس کو اہمیت نہیں دی جارہی ہے اور بعض وقت ہم ایسی جذباتیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس سے ہمارے مقصد کو کوئی دیرپا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور دشمن اس سے اپنا دیرپا فائدہ اٹھا لیتا ہے، اگر ہم کو اس صدی کو اسلامی صدی بنانا ہے تو جوش وجذبہ کی بیداری قائم رکھتے ہوئے علمی ودعوتی بیداری پر زیادہ توجہ صرف کرنا ہوگا، بلکہ جوش پر ہوش غالب کرنا ہوگا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم کو اپنی انفرادی زندگیوں میں اس اعلیٰ کردار

کو بحال کرنا ہوگا جو دوسروں پر اثر انداز ہونے اور معاملات کو صحیح رخ دینے میں اہم ترین کام انجام دیتا ہے اور جو اسلام کے متعلق حسن ظن پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے اور اسلام کو سرعت کے ساتھ دنیا میں پھیلنے کا فائدہ دراصل ایسے ہی اعلیٰ کردار کی بنا پر ہوا ہے اور دراصل ہمارے دنیاوی زوال کی تاریخ بھی ہمارے اسلامی کردار وسیرت میں زوال پیدا ہونے سے جڑی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين﴾۔

"تم سب سے بلند رہو گے اگر تم ایمان والے ہوئے۔"

لہذا مسلمانوں کی سربلندی دراصل ان کے اسلامی کردار وسیرت سے وابستہ ہے، اس کے بغیر عزت وسربلندی حاصل نہیں ہوسکتی اور اس کردار وسیرت کو پیدا کرنے کے لئے ہم کو دعوتی کام بڑے وسیع اور مخلصانہ پیمانہ پر کرنا ہوگا، اس کے بغیر نہ ہمارا حال اچھا ہوسکتا ہے اور نہ ہمارا مستقبل شاندار ہوسکتا ہے، موجودہ صدی میں ہماری عظمت کا انحصار اسی پر ہے کہ ہم ان وسائل قوت واثر کو اختیار کریں جن سے مغرب نے مشرقی قوموں کو غلام بنایا ہے اور علم وتعلیم وذرائع ابلاغ اور وقت کے مطابق حکمت عملی اور اس کے ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ اعلیٰ اسلامی حوصلہ اور کردار اختیار کریں، جن سے آراستہ ہونے پر ہمارا اولین اسلامی عہد اعلیٰ ترین مثال اور دنیا کی قوموں کے مقابلہ میں سب سے بلند وبالا عہد بنا تھا، اللہ تعالیٰ ہم کو ان باتوں کی صحیح توفیق عطا فرمائے۔

❖ ❖ ❖

دینی تعلیم
اور
مدارس کی اہمیت

جو علم رب کے نام سے وابستہ نہیں وہ تباہی کا پیش خیمہ ہے[1]

یہ میرے لئے بڑی خوشی ومسرت کا مقام ہے کہ میں یہاں دار العلوم تاج المساجد میں حاضر ہوا، یہاں اس سے پہلے بھی میری حاضری بارہا ہوتی رہی ہے، لیکن پچھلے چند سالوں سے حاضری کا اتفاق ذرا کم ہوا، یہاں آکر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا میں اپنے گھر میں ہوں، ندوۃ العلماء کے ذمہ داران اور وہاں کے کارکن اس کو اسی طرح اپنا ادارہ سمجھتے ہیں جس طرح ندوۃ العلماء کو سمجھتے ہیں، اور یہی حال یہاں کے ذمہ داروں اور کارکنوں کا ہے کہ وہ ندوہ کو اپنا ہی ادارہ سمجھتے ہیں، دونوں میں پورا ربط اور مکمل ہم آہنگی ہے، بس اتنا فرق ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء بڑا دار العلوم ہے اور دار العلوم تاج المساجد اس کے مقابلہ میں چھوٹا دار العلوم ہے، میرا تعلق اس ادارہ سے قلبی اور جذباتی تعلق ہے، اور اسی لئے اس کی کامیابی اور ترقی کا ہمیشہ خیال رہتا ہے، اور جی چاہتا ہے کہ یہ وسطی ہند کا ایک بڑا علمی، تعلیمی، تربیتی ودعوتی مرکز بن جائے، یہاں سے علم ومعرفت اور تبلیغ ودعوت کا نور پھیلے تاکہ لوگ اس سے زیادہ سے

---

(۱) دار العلوم تاج المساجد کی انجمن حزب الطلبہ میں ۳۰؍ جون ۲۰۰۰ء کو کی گئی تقریر۔

زیادہ فائدہ اٹھائیں، اس لئے کہ مسلمان اگر چہ اس ملک میں اقلیت میں ہیں لیکن اقلیت میں ہونے کے باوجود دنیا کے ملکوں میں آباد مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے نمبر دو پر ہیں، نمبر ایک پر انڈونیشیا ہے اور نمبر دو پر ہندوستان آتا ہے، تو اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہ ملک کتنا بڑا ہے اور یہاں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود کتنی بڑی تعداد میں ہیں، اور ظاہر ہے کہ جتنی بڑی آبادی ہوگی اسی کے لحاظ سے ایسے اداروں کی تعداد بھی زیادہ ہونی چاہئے جس سے ان کی ضرورت پوری ہوسکے۔

شریعت اسلامیہ کے تحفظ کی فکر خود مسلمانوں کی ذمہ داری ہے

مسلمان ایک امت ہیں، سب ایک مذہب کے پیرو ہیں، مذہب کے معنی طریقہ کے ہیں، یعنی مسلمان ایک متعین طریقہ پر ہیں، ہندوستان ایک بڑا ملک ہے، اس میں بسنے والے سارے لوگ ایک مذہب کے نہیں ہیں، بلکہ یہاں متعدد مذاہب کے لوگ آباد ہیں، اگر چہ یہاں کے باشندے سیاسی اور ملکی تقسیم کے لحاظ سے ایک قوم یعنی ہندوستانی ہیں، لیکن اگر دیکھا جائے تو عقیدہ، عبادت، رہن سہن، طرز معاشرت اور تہذیب وثقافت کے اعتبار سے وہ متعدد قوموں کی صورت میں متعدد اقوام کا مجموعہ ہیں، ان میں مسلمان سب کے سب ایک امت ہیں، ایک جامع وعظیم مذہب کے ماننے والے ہیں، وہ ایک متفقہ وحدت اور طریقہ کے ساتھ ہیں، ان کا عقیدہ ایک ہے، ان کا مذہب ایک ہے، ان کی بنیادی تہذیب ایک ہے، ان کی مذہبی ثقافت ایک ہے، ان کے بنیادی مسائل اور رجحانات جوامت مسلمہ کی قدروں پر مشتمل ہیں وہ ایک طرح کے ہیں، اور ظاہر ہے کہ مسلمان جب ایک پوری امت ہیں تو ان کی مقامی ضرورتیں، ان کی زندگی کے علاقائی تقاضے اور جوان کے مقامی زندگی کے مختلف پہلو ہیں ان سب کے تقاضے، پھر ملت کے مشترک اور مخصوص تقاضے، نیز اقتصادی ضروریات بیشمار ہیں، ان کے سماجی تقاضے بھی ہیں اور سیاسی تقاضے بھی ہیں اور بھی

زندگی کے جو بیشمار پہلو ہیں ان سب کے الگ الگ تقاضے ہیں، یہ تقاضے پورے کرنے کے لئے مسلمانوں کو خود فکر کرنی ہوتی ہے اور انتظام کرنا ہوتا ہے اور اس کے لئے اپنی سمجھ اور وسائل پر اعتماد کرنا ہوتا ہے، اس لئے کہ آج کل دنیا میں جو نظامہائے حکومت رائج ہیں وہ عموماً سیکولر نظامہائے حکومت ہیں، جن میں حکومت کو کسی مذہب میں دخل دینے کا حق نہیں ہوتا ہے، ہر مذہب والے اپنے مذہب کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کے لئے آزاد ہوتے ہیں، اور اپنی زندگی کے تقاضوں کو خود پورا کر سکتے ہیں، حکومت کو اس میں مداخلت کرنا نہیں ہوتا، ہندوستان بھی ایک سیکولر ملک ہے، اس کا دستور سیکولر ہے، اس دستور میں یہاں کے سارے رہنے والوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا اور اپنی زندگی کے تقاضوں کو اپنے طور پر پورا کرنے کا حق دیا گیا ہے، اپنی زبان، اپنی ثقافت، اور اپنی قوم وملت سے متعلق معاملات میں ان کو پورا اختیار رہے، اس کی وجہ سے ہم پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جب حکومت کے ذمہ مسلمانوں کے تقاضے پورے کرنا نہیں ہے، اور جب ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ ہم اپنے مذہب کے تقاضوں اور ملت کی ضروریات اور اسلام کے تقاضوں کو اور اپنی مسلمان قوم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے آزاد ہیں تو ہم پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور یہ ذمہ داری ہمارے ذہین اور دانشور طبقہ پر سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے، اس میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہماری کیا کیا ضروریات اور تقاضے ہیں؟ اس لحاظ سے ہمیں ان سب کا انتظام اور بندوبست کرنا ہے۔

سب سے بڑی ذمہ داری

ان ذمہ داریوں میں سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں عقیدۂ توحید اور کتاب وسنت کی تعلیمات کو نافذ کریں، اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے والے بنیں، قرآن وسنت کی تعلیمات ہماری زندگیوں میں

جاری وساری ہوں، اگر ہم اس سے ہٹیں گے تو ہمارا شمار امت مسلمہ میں نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ملک کے مسلمان اسلام کے وفادار ہیں، اور الحمد للہ ہمارا دانشور طبقہ خاص طور پر جو علم دین کی فہم وفراست کا حامل زمرہ ہے، امت مسلمہ کے بقا کی فکر وجذبہ رکھتا ہے اور مسائل کو حل کرنے کی سمجھ رکھتا ہے وہ کوششیں بھی کرتا رہتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اتنے بڑے بڑے ملی ادارے قائم ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی قائم ہے، اتنے بڑے بڑے دار العلوم اور مدارس قائم ہیں، یہ سب اس لئے ہے کہ ہم اپنے ملی اور اجتماعی مسائل اور ضروریات کو اچھی طرح سمجھ سکیں، ان کو حل کرنے کی کوشش کریں اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کو اپنی زندگیوں میں نافذ کریں۔

علم وتعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی سبقت

یہ زمانہ علم کے رواج کا زمانہ ہے، مسلمانوں کی طرف سے علمی وتعلیمی جدو جہد ونشر واشاعت کے اہتمام کے وقت سے علم وتعلیم کی وسعت وترقی کا جو دور شروع ہوا وہ غیر معمولی دور تھا، اور اس دور میں جس وقت مسلمان تعلیمی وعلمی لحاظ سے اپنے عروج پر تھے یورپ کی قومیں علم کے ساتھ نفرت کا معاملہ کر رہی تھیں، ان کے حکمرانوں کی طرف سے ان افراد کو جو علم کی تحقیقات کرتے سزائیں دی جاتیں، ان کی کھالیں کھنچوادی جاتیں، اس کے برعکس مسلمانوں نے علم سے بے انتہا دلچسپی لی، انہوں نے علم حاصل ہی نہیں کیا بلکہ دوسروں کو سکھایا اور علم میں اضافہ کیا، اسے ترقی دی، یورپ میں علم کے عروج کا دور مسلمانوں سے سیکھنے اور ان سے علم حاصل کرنے سے شروع ہوا، مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ ان کی مذہبی تعلیمات میں دلائی گئی، جب کہ یورپ میں علم سے دلچسپی مذہبی طور پر بری سمجھی جاتی تھی، قرآن جگہ جگہ اس پر توجہ دلاتا ہے کہ

غور کرو، عقل وشعور سے کام لو، اور فرمایا کہ انسان کو پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام آسمان وزمین کو پیدا کرنا ہے ﴿أ أنتم أشد خلقا أم السماء، بناها، رفع سمكها فسواها، وأغطش ليلها وأخرج ضحاها، والأرض بعد ذلك دحاها،أخرج منها ماء ها و مرعاها، والجبال أرساها، متاعاً لكم ولأنعامكم﴾

(سورہ النازعات: ۲۷/۳۳)

"بھلا تمہارا پیدا کرنا (فی نفسہ) زیادہ سخت ہے یا آسمان کا، اللہ نے اس کو بنایا اس طرح سے کہ اس کی چھت (یعنی آسمان) کو بلند کیا، اور اس کو درست بنایا، اور اس کی رات کو تاریک بنایا، اور اس کے دن کو ظاہر کیا، اور اس کے بعد زمین کو بچھایا، اور بچھا کر اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا، اور پہاڑوں کو اس پر قائم کر دیا، تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے فائدہ پہونچانے کے لئے۔"

مسلمانوں کو یہ باتیں بتا کر دراصل ان کو ان پر غور کرنے اور ان سے نتائج نکالنے اور ان نتائج سے فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے، اور اسے اپنی اکثر مخلوقات پر برتری اور فضیلت عطا کی ہے، اور یہ فضیلت بظاہر علم ہی کی بنیاد پر عطا کی گئی ہے، اور انسان ہی میں یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ وہ علم سے فائدہ اٹھا کر اسے ترقی دے سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام کو سمجھ کر حاصل کر کے خود کو اور ساری انسانیت کو فائدہ پہونچا سکتے ہیں، ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔

دنیا کی تباہی کا سبب

علم کی بہت سی شاخیں ہیں، علم ایک بحر زخار اور دریائے ناپیدا کنار ہے، اس میں آدمی غوطے لگاتا ہے، اگر اس کی رسائی تہہ تک نہ ہو تو اسی میں غوطے کھاتا رہے

گا اور پورا فائدہ نہیں اٹھا پائے گا، جیسے کوئی کسی لق ودق صحراء میں کھو جائے، اسی لئے ضروری ہے کہ علم کو اللہ کا انعام اور اس کی نعمت سمجھتے ہوئے اس مقصد کے لئے حاصل کیا جائے کہ علم کے بحر زخار سے کس طرح فائدہ اٹھایا جائے پیغمبروں سے رہنمائی حاصل کی جائے، اور یہی بات پہلی وحی میں بھی سکھائی گئی ہے، چنانچہ فرمایا گیا: ﴿اقرأ باسم ربك﴾ (سورہ علق:۱) (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! اپنے رب کے نام کے سہارے پڑھو) اس طرح علم کے پیدا کرنے والے اور عطا کرنے والے یعنی رب العالمین نے علم کو رب واحد سے وابستہ کر دیا، کیونکہ اگر رب سے جو علم کا خالق ہے علم وابستہ نہ ہو تو پھر انسان بھٹک جاتا ہے، دنیا میں آج جو خرابیاں عام ہو رہی ہیں، کہ پڑھے لکھے لوگ بے شمار ہیں لیکن پھر بھی جرائم ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا علم رب سے وابستہ نہیں ہے، اس لئے وہ انہیں ظلم وزیادتی اور جور وستم سکھاتا ہے، اور دنیا میں برائیاں اس کی وجہ سے عام ہو رہی ہیں۔

مسلمان یورپ کے معلم اول ہیں

اب یہ رہنمائی ہمیں کہاں سے حاصل ہوگی؟ تو طلبہ کو اساتذہ سے اور اساتذہ کو قرآن وحدیث سے یہ رہنمائی ملے گی، علم آج کل تباہی کے لئے استعمال ہو رہا ہے، یورپ نے مسلمانوں کے علمی عروج کے دور میں علم کے ساتھ صدیوں دشمنی کی، تحقیقات کرنے والوں کی کھال کھینچی، مسلمان علم میں ترقی کرتے رہے، اور اساتذۂ عالم بن گئے جس کا یورپ کے انصاف پسند مؤرخین نے بعد میں اپنی کتابوں میں صاف صاف اعتراف بھی کیا ہے کہ مسلمان عرب ہمارے معلم اول ہیں، مسلمان علم میں قرآن وحدیث سے رہنمائی حاصل کرتے رہے، پھر دوسروں نے انہیں سے علم سیکھا، لیکن پھر مسلمان آہستہ آہستہ علم میں زوال کا شکار ہوتے گئے اور دوسری قومیں

خاص طور سے یورپین قومیں علم میں ترقی کرتی گئیں لیکن انہوں نے علم کا رشتہ رب سے کاٹ دیا اور اس طرح علم تباہی کا باعث بن گیا، اب اس کا تعلق دل اور اپنی خواہش نفس سے کرلیا کہ بس ہم جس طرح چاہیں گے اس کو استعمال کریں گے، اس طرح سینکڑوں ہزاروں کی خواہش نفس علیحدہ علیحدہ ہونے کی وجہ سے آپس میں ٹکرا جاتی ہے، ہر ایک کا نفس اور دل الگ الگ ہے اور سب کی خواہشات الگ الگ ہیں، ان میں آپس میں کشمکش ہوگی، اور اس کا خودغرضی اور نفس پرستی پر دارومدار ہوگا اور لڑائی کی نوبت آجائے گی، اور آج دنیا میں یہی ہورہا ہے، علم میں یورپ نے بڑا کمال حاصل کرلیا ہے، لیکن اسے اپنی چاہ کا علم بنالیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ آج لکھے پڑھے لوگ کیا کیا مظالم ڈھا رہے ہیں، ایسے آلات تیار کرلئے گئے کہ آن کی آن میں پورے کا پورا ملک تباہ ہوجائے، من کے چاہتے ہی سب کو تہس نہس کردیں۔

انسان کا علم اللہ کا دیا ہوا ہے

علم انسان کو دیگر مخلوقات پر ممتاز کرتا ہے، آدم علیہ السلام کو علم کی بنیاد پر امتیاز عطا کیا گیا، قرآن کریم کے پہلے پارہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش، فرشتوں کے سوال جواب اور آدم علیہ السلام کو علم کی بنیاد پر فضیلت عطا کئے جانے کا واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے آپ وہاں دیکھ سکتے ہیں، ﴿وعلم آدم الأسماء كلها......﴾ (سورہ البقرہ:۳۱) وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ علم ہے، انسان کا علم اللہ کا دیا ہوا ہے، اب اگر انسان اسے خود اپنی تباہی کے لئے استعمال کرنے لگے تو یہ اس کا قصور ہے۔

علم سے صحیح فائدہ اٹھانے کے لئے علم کو اللہ کا فضل اور اس کا انعام سمجھنا ہوگا، اسے اللہ کے نام سے جوڑنا ہوگا اور اسلام کی رہنمائی حاصل کرنی ہوگی، ہمیں خود بھی علم

سے فائدہ اٹھانا ہے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہونچانا ہے، یہی ہمارا پیغام ہے کہ علم سے فائدہ اٹھاؤ اور اس پر محنت کرو، زندگی کے مختلف پہلوؤں کا علم حاصل کرو، علم کو اللہ کے فضل اور انعام سے جوڑو، یورپ اگرچہ عیسائی ہے یعنی اہل کتاب، لیکن اس نے علم کا رشتہ اللہ کے فضل سے کاٹ دیا ہے، اور بطن ومعدہ سے جوڑ دیا ہے، اب یہ ہم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ علم کا رشتہ اللہ سے جوڑیں، علم میں محنت اور ترقی کریں، ہمارے اسلاف نے صدیوں علم میں عروج حاصل کیا اور اسے ترقی دی، پھر ہم کیوں کوتاہی کریں، دوسری قومیں جب علم میں آگے بڑھ گئیں تو ہم کیوں پیچھے رہیں؟

علم محنت چاہتا ہے

ہمارے دار العلوم اور مدارس اسلامیہ اسی نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہیں، ندوۃ العلماء اسی کے مطابق اپنا نصاب بناتا ہے، اس دار العلوم کا علم سے تعلق صحیح نقطۂ نظر ہے، لیکن صرف باتیں کرنے سے علم حاصل نہیں ہوتا، علم محنت چاہتا ہے، اس میں دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ: "العلم لا يعطيك بعضه حتى تعطيه كلك، فإذا أعطيته كلك فبعضه أيضا في محل خطر" یعنی علم تمہیں اپنا تھوڑا حصہ بھی نہیں دے سکتا جب تک کہ تم اسے اپنا پورے کا پورا نہ دیدو، اور پورا دینے پر بھی اس کا تھوڑا حصہ حاصل ہو جانا بھی محل خطر ہے۔

علم بڑی محنت، مشغولیت اور توجہ چاہتا ہے، رات دن اس میں اپنے کو ڈبو دینا چاہتا ہے، علم میں کمال واختصاص پیدا کرنے کے لئے اپنے کو اس میں لگا دینا ہوگا، علم آرام وراحت اور تفریحات کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتا، اور اس کو اپنے اساتذۂ کرام کی رہنمائی میں حاصل کرنا ہوگا ورنہ آپ بھٹک جائیں گے، محنت اور رہنمائی دونوں ہوں تب علم حاصل ہوگا، علم کے بارے میں امت مسلمہ کا نظریہ جامع

اور مفید علم کا ہے جو کسی کی رہنمائی میں رہ کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

لہذا خوب محنت کریں، علم میں انہماک ہو، علم بڑا غیرت منداور خوددار ہے، بے توجہی کرنے پر علم بھاگتا ہے، علم اسی کو حاصل ہوتا ہے جو اس پر محنت کرے، آپ یہاں دور دراز سے اپنا گھر بار، ماں باپ اور بھائی بہن اور گھر کا آرام وآسائش سب چھوڑ کر علم حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، یہ محل صحیح ہے، آپ کا انتخاب صحیح ہے، آپ بہت صحیح جگہ پر آئے ہیں اور بہت ترقی کر سکتے ہیں، آپ اس کی قدر کریں، اپنا وقت لہو ولعب اور فضول مصروفیات میں نہ گزاریں، بلکہ علم میں پوری یکسوئی، محنت اور لگن کے ساتھ لگے رہیں، انشاء اللہ اللہ کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی اور آپ کو علم میں ترقی اور کامیابی نصیب ہوگی۔

❖ ❖ ❖

پاجا سراغ زندگی (۱)

معلومات کا تنوع

انسان کی زندگی اتنی متنوع پہلوؤں کی ہے کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو عجیب چیز بنایا ہے اور اس کو زمین کا سردار بنایا ہے، سردار کسی جماعت کا ہوتا ہے، کسی ملک کا سربراہ ہوتا ہے تو وہ بہت سی خصوصیات کا مالک ہوتا ہے، کوئی اپنے علاقہ یا اپنی جماعت میں بڑا ہے تو اس میں کچھ خصوصیت ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر سردار بنایا ہے اس کے اندر بہت سی خصوصیات اللہ نے رکھی ہیں جو دوسری مخلوقات میں نہیں پائی جاتیں، ان سارے پہلوؤں سے تعلق رکھنے والی معلومات ہیں، خصوصیات اور صفات ہیں تو جس پہلو کو بھی لے لیجئے اس کی معلومات بہت ہیں، اس کے اوصاف بہت ہیں اور آدمی ان اوصاف کو ان خصوصیات کو جانتا ہے تو یہ اس کا علم ہے، علم کہتے ہی ہیں معلوم ہونے کو، علم معلوم شدہ چیز کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور معلوم کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے مصدر بھی ہے اور اسم بھی، تو علم حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم معلومات حاصل کر رہے ہیں، وہ معلومات حاصل کرتے ہیں جن سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں اگر ہر پہلو کی معلومات

---

(۱) جامعہ اسلامیہ قلندر پور، مظفر پور اعظم گڈھ میں طلبہ سے کیا گیا خطاب۔

حاصل کی جائیں تو وہ اتنی زیادہ ہیں کہ آدمی حاصل ہی نہیں کرسکتا، اس لئے انجینئر انجینئرنگ کی معلومات حاصل کرے گا، ڈاکٹر ہے تو ڈاکٹری کی معلومات حاصل کرے گا، کسان ہے تو کاشتکاری کی معلومات حاصل کرے گا، تاجر ہے تو تجارت کی معلومات حاصل کرے گا تو جس چیز کی انسان کو ضرورت پڑتی ہے وہ اس کی معلومات حاصل کرتا ہے۔

خداشناسی کا علم انسان کی بنیادی ضرورت ہے

انسان کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کو پہچانے، اس کے حکم کے مطابق زندگی گزارے یہ بنیادی چیز ہے اور باقی چیزیں اس کے بعد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے وہ چیزیں ہمارے لئے فراہم کردی ہیں جو اس دنیا میں موجود ہیں ہم جب چاہیں اس کو حاصل کرسکتے ہیں لیکن بنیادی چیز جس کے بغیر ہمیں کامیابی حاصل نہیں ہوگی وہ معلومات ہیں جو اللہ کو راضی کرنے والی ہیں اللہ کے حکم کے مطابق کام کرنے کی معلومات ہیں اور اسی کا نام دین ہے تو دینی معلومات ہمارے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ مدارس اسی لئے قائم کئے جاتے ہیں کہ وہ سامان مہیا کیا جائے جس سے ہم اپنے دین کی معلومات حاصل کرسکیں۔

قدیم صالح وجدید نافع کا امتزاج

اصلاً یہ مدارس اسی مقصد سے قائم کئے گئے ہیں لیکن چونکہ ہمیں دین کے ساتھ اپنی زندگی کو بھی چلانا ہے اور اپنی زندگی کو بھی استوار کرنا ہے، اسی لئے مدرسوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دونوں چیزوں کو جمع کیا گیا ہے، آپ دینی معلومات بھی حاصل کریں جن سے آپ اپنی آخرت سنوار سکیں اور اللہ کی رضا اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی کو قائم کرسکیں خود بھی اس پر عمل کرسکیں اور دوسروں کو بھی کراسکیں اور

وہ معلومات اور علوم بھی طلبہ کو مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں جن سے وہ اس دنیا میں کام چلا سکیں، وہ معلومات یا علوم جو دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہیں ان میں تاریخ ہے، جغرافیہ ہے، اور اسی طرح زندگی کا کام چلانے کے لئے حساب ہے، اور اسی طرح دوسری معلومات ہیں جن سے ہم کو سابقہ پڑتا ہے جن کے ذریعہ ہم اپنی زندگی کو درست کر سکتے ہیں یہ علوم بھی ضروری ہیں، تا کہ ایک صحت مند اور خوشحال انسان کی طرح آپ اپنی زندگی گزار سکیں، تو ہمارا جو نصاب و نظام تعلیم ہے اس میں اس چیز کو بھی رکھا گیا ہے، اسی طرح دوسروں سے بات کرنے اور دوسرے کی بات سمجھنے کے لئے زبان کی اہمیت ہے، جس زبان سے بھی واسطہ پڑتا ہے اس زبان سے ہمیں واقف ہونا چاہئے، آپ دیکھیں گے کہ نصاب میں کئی زبانیں رکھی گئیں جن سے ہم ہندوستانیوں کو سابقہ پڑتا ہے عربی سے تو اس لئے کہ وہ ہماری مذہبی زبان ہے پھر عربوں کی زبان ہے اور اردو زبان ہے، ہندی ہے اور فارسی بھی کسی حد تک ہے، اگر چہ اب فارسی کا رواج نہیں رہا لیکن پہلے رہ چکا ہے، کتابیں بہت سی فارسی میں ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ان مدارس میں زندگی کی اہمیت وضرورت کو سامنے رکھ کر یہ نصاب بنایا گیا ہے کہ دین کے علوم بھی ہم کو حاصل ہوں اور دنیا کی ضروری معلومات اور علوم بھی ہم کو حاصل ہوں۔

مسئلہ طلب صادق کا ہے

اب مسئلہ سارا اس کا ہوتا ہے کہ آپ اس کو صحیح طور پر حاصل کریں، مدارس کا جو کام تھا وہ انہوں نے کر دیا کہ بہترین نصاب انتخاب کر کے مضامین کو رکھ دیا اور اس کے لئے وسائل مہیا کر دئے، سکھانے والے پڑھانے والے اور وہ سامان کہ جس سے علم حاصل کیا جا سکتا ہے وہ سب مدارس نے مہیا کر دیا وہ یہی کر سکتے ہیں لیکن علم کو آپ

کے اندر اتار دیں یہ ان کے بس میں نہیں ہے نہ ان کے بس میں ہے نہ آپ کے اساتذہ کے بس میں ہے، یہ صرف آپ کے بس میں ہے آپ چاہیں گے تو علم حاصل کریں گے نہیں چاہیں گے تو نہیں حاصل کریں گے، آپ دس دس بیس بیس سال تک اگر مدرسہ میں رہیں اور علم حاصل کرنے کی طرف توجہ نہ کریں تو آپ کورے کے کورے یہاں سے جائیں گے، یہ وسائل، یہ اسباب، یہ سامان اسی وقت کارآمد ہوں گے جب آپ علم حاصل کرنا چاہیں اور علم حاصل کرنے کے لئے آپ فکر کریں ورنہ النادی العربی جیسی دس انجمنیں قائم کردی جائیں اور بہتر سے بہتر استاذ لاکر کھڑا کردیا جائے ایسا کہ ملک میں اس سے بہتر استاذ نہ ہوں اور نہ معلوم کیا کیا انتظامات کردیئے جائیں لیکن اگر آپ کو فکر نہیں ہے علم حاصل کرنے کی تو علم نہیں حاصل ہوگا بلکہ کورے کے کورے رہیں گے۔

قوت ارادی اور عزم راسخ کی ضرورت

اس لئے بنیادی بات یہ ہے کہ آپ طے کریں کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے اور ہمیں اپنے اندر استعداد پیدا کرنا ہے، علمی صلاحیت پیدا کرنا ہے جب آپ اس کا ارادہ کریں گے اور اس کے مطابق محنت کریں گے تو پھر علم آئے گا، آدمی یہاں سے از ہر چلا جائے، دنیا کی بہتر سے بہتر یونیورسٹی میں چلا جائے اور وہاں اگر اسے علم حاصل کرنے میں دلچسپی نہیں ہے تو وہاں سے اسی طرح لوٹے گا جس طرح یہاں سے گیا تھا، ایسی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ بیس بیس سال بلاد عربیہ میں رہا ہے آدمی، اور کوئی استعداد نہیں پیدا ہوئی، اور اسی نے فکر کی تو سال بھر کے اندر نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ گیا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ جب استاذ ہو گئے تھے اس کے بعد باہر گئے، لیکن باہر جانے سے پہلے اسی ملک میں یہیں کے اساتذہ سے اور

یہیں کی کتابوں سے انہوں نے عربی زبان میں مہارت حاصل کرلی تھی کہ عرب ان کی قدر کرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے آج مدارس کو اتنے وسائل عطا فرمائے ہیں کہ جس پر لوگ رشک کریں، آج سے پہلے یہ وسائل نہیں تھے، آپ دیکھیں گے کہ آپ کے بڑوں نے کس طرح علم حاصل کیا کچھ تو ایسے ہوں گے کہ چھپروں کے نیچے بیٹھ کر علم حاصل کیا ہوگا اور ایسے بھی ہیں جو غربت کی وجہ سے جاڑوں میں مسجد کی چٹائی میں لپٹ جاتے تھے کہ سردی سے کچھ بچ سکیں اور سردی سر کی طرف سے لگ رہی ہے پیر کی طرف سے لگ رہی ہے چٹائی کہاں تک کام دے گی، اور فاقہ کر رہے ہیں اور علم حاصل کیا۔

اپنے اندر امتیاز پیدا کیجئے

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ایسی صلاحیت رکھی ہے جس کو ایک مثال سے سمجھئے، ربڑ کی صلاحیت ہر انسان کے اندر ہے، کھینچئے، کھنچتا چلا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ اس صلاحیت کو بڑھائے اور اس سے فائدہ اٹھائے، آدمی نبی تو نہیں بن سکتا اور انسان کے دائرہ سے بھی باہر نہیں نکل سکتا، باقی جتنی ترقی کرسکتا ہے اس دائرہ کے اندر رہکر کرسکتا ہے بڑے سے بڑا ولی بن سکتا ہے، بڑے سے بڑا عالم بن سکتا ہے، بڑے سے بڑا خطیب بن سکتا ہے، بڑے سے بڑا مصنف بن سکتا ہے، بڑے سے بڑا محقق بن سکتا ہے، اور بڑے سے بڑا لیڈر بن سکتا ہے، قائد بن سکتا ہے، آپ دیکھئے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے کتنا کمزور اور کتنا معذور ہوتا ہے کہ وہ بتا نہیں سکتا ہے کہ اس کو بھوک لگی ہے، یا تکلیف ہے، ماں اس کو کسی طریقہ سے سمجھتی ہے کہ اس کو بھوک لگی ہے یا تکلیف ہے لیکن وہ بڑھ کر کیا ہوتا ہے،

بعض وقت اتنا بڑا قائد ہوتا ہے کہ دنیا کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، بعض وقت اتنا بڑا مفکر ہوتا ہے کہ اس کی رائے سے اور اس کے علم سے دنیا مستفید ہوتی ہے اور صدیوں اس کا نام چلتا ہے۔

ترقی کا انحصار آپ کی محنت پر ہے

اللہ نے ہر انسان کے اندر بڑی صلاحیت رکھی ہے ایسی صلاحیت جو بڑھے، لیکن کیسے بڑھے گی خود بخود نہیں بڑھے گی بڑھانے سے بڑھے گی جتنا آپ بڑھایئے بڑھتی چلی جائے گی اور ایسے درجہ تک پہونچ جائے گی کہ لوگ حیران ہوں گے کہ ارے یہ کیا ہے کیسی شخصیت ہے کیسا بڑا عالم ہے کتنا بڑا خطیب ہے، لیکن کیسے ہوتا ہے خود بخود نہیں، بلکہ محنت کرنے سے ہوتا ہے اپنے کو کھپانے سے ہوتا ہے اور ان وسائل، ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانے سے ہوتا ہے، ہمارے اسلاف نے معمولی وسائل میں اپنے کو بنایا اور ترقی دی، آپ کے لئے تو بہت وسیع میدان ہے، ان سہولتوں کے ساتھ ان انتظامات کے ساتھ آپ معلوم نہیں کیا کیا کر سکتے ہیں تصور کرنا مشکل ہے لیکن انحصار آپ کی محنت پر ہے۔

یاد رکھیئے! کہ صلاحیت کی دنیا قدر کرتی ہے وہ شخص ضائع نہیں ہوتا جس میں صلاحیت پیدا ہو جائے جس میں کمال پیدا ہو جائے دنیا مجبور ہے ماننے پر اور اس کی قدر کرنے پر، اور اگر آدمی اپنے اندر امتیاز نہ پیدا کرے، صلاحیت نہ پیدا کرے تو ایک ایسا عام انسان ہوتا ہے کہ سڑک پر چلا جا رہا ہے کوئی دیکھتا بھی نہیں اور کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جا رہا ہے۔

❖ ❖ ❖

انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا تحفظ
تعلیمی وسائل کے ذریعہ

انسان کو دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں اپنی زندگی کے لئے تین پہلوؤں کی فکر کرنی ہوتی ہے، ایک پہلو اس کی جسمانی صحت و زندگی کی لازمی ضروریات جو کھانے پینے اور لباس و رہائش کی ضرورتوں پر مشتمل ہوتا ہے، دوسرا پہلو اس کی عزت و شہرت کا جو انسان کے دیگر مخلوقات پر برتر مقام کے اظہار سے تعلق رکھتا ہے، تیسرا پہلو اخلاق و کردار اور انسانی خصوصیات کا جن کو بہتر سے بہتر شکل میں اختیار کرنا انسان کے شایان شان ہوتا ہے، ان سب پہلوؤں میں اعلیٰ صلاحیت اور اعلیٰ کردار کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے میں علم بہترین وسیلہ اور ذریعہ بنتا ہے۔

انسان کی زندگی کے ان مذکورہ پہلوؤں میں سے جہاں تک اول پہلو کا تعلق ہے اس میں دوسری مخلوقات بھی ان ضروریات کی حاجت مند ہیں، لیکن وہ علم کے وسیلہ سے محروم ہونے کی وجہ سے صرف سطحی اور محض طبعی انداز میں اپنا کام چلا لیتی ہیں، اور جہاں تک ان پہلوؤں میں سے دوسرے اور تیسرے پہلو کا تعلق ہے جو انسان کی دوسری مخلوقات پر برتری کا لحاظ رکھنے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے تعلق رکھتے ہیں تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کے عنوان سے جو ہدایات

واحکامات دیئے گئے ہیں ان میں انسان کی عزت وشرف کے لائق اعلیٰ معیار وکردار کو واضح طریقہ سے بیان کیا گیا ہے، اور اصل یہ ہے کہ اس کو اپنے خالق اور پروردگار کی مرضی سے جوڑا گیا ہے، کیوں کہ ان دو پہلوؤں کی خوبیوں کا برتر وبہتر معیار خدائے برتر وبہتر کے بتائے ہوئے طریقہ ہی سے پیدا ہوسکتا ہے، کیونکہ انسانوں کا پروردگار جو ان کا خالق ہے ان کے بہتر معیار کو زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور وہی انسان میں دیکھنا بھی چاہتا ہے، چنانچہ اس کو بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں انبیاء اور رسول بھیجے اور پھر آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور ان کو انسان کے برتر وبہتر اخلاق وکردار کی تفصیل بتائی، اور اس زندگی میں انسان کی کامیابی کا اسی کو ذریعہ بتایا، اور اس کا جو ضروری علم ہے وہ عطا کیا۔

اللہ کے بندوں کی ایک تعداد نے جو مسلمان کے لفظ سے موسوم ہیں ان پر عمل کرکے دکھایا، لیکن انسانوں کی بڑی تعداد نے صرف اپنی جسمانی اور نفس کی خواہش سے تعلق رکھنے والی باتوں ہی پر اپنا انحصار رکھا، اور اپنے علم کو بھی اسی کے ساتھ محدود کرلیا، حالانکہ نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ علم جو انسان کے فلاح وصلاح کا ضامن ہے وضاحت کے ساتھ پہونچایا، اس علم سے بے توجہی اور اس سے حاصل ہونے والی رہنمائی سے گریز کرنے پر انسانی معاشرہ گندگیوں میں پھنستا چلا جارہا ہے، اور ایسے اخلاق وکردار عام ہوتے جارہے ہیں جو رب العالمین کی ناراضی کا باعث ہیں، اور جو انسان کے مقام بلند کے بالکل منافی ہیں، اور ان کو اختیار کرنے پر انسان مختلف حیوانات کے گھٹیا کردار کے نمونے پیش کرتا ہے، یعنی وہ کردار جو انسان کی انسانی خصلتوں اور خوبیوں کے منافی ہے، ان میں کہیں تو وہ چیتے اور بھیڑیئے کی مانند بن جاتا ہے، اور اس میں وہ دوسروں کو کچلنے، دبانے اور کھا جانے کی فکر کرتا ہے، کہیں پر وہ کتے اور بلی کی خصوصیات اختیار کرلیتا ہے جس میں نظر محض اپنے انفرادی اور محدود

فائدہ پر ہوتی ہے، اور کہیں اپنی خود غرضانہ خوش نمائی اور ظاہری چمک دمک کے اظہار کے لئے نفس پرستانہ طریقے اختیار کرتا ہے، لیکن اخلاق و کردار کی خوبی جو انسان کی انسانیت کا اصل جوہر ہے اس کی طرف غیر معمولی بے توجہی میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اپنی اس بے توجہی کو انسان نے اپنے علم و تعلیم کی راہوں تک پہونچا دیا ہے، وہ علم و تعلیم جو انسان کو اس کے معزز مقام کے لائق بنانے اور بلندیوں تک پہونچانے کے ذریعہ کے طور پر خدا تعالیٰ کی طرف سے عطاء کیا گیا ہے، علم کو محض اپنے نفس کی سطحی خواہشات کا تابع بنا دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ قوموں کا پورا نظام تعلیم ان کے اس عیب کی وجہ سے محض نفس کے تقاضوں کو مقصد بنا کر چلایا جا رہا ہے، اس سے انسان کی انسانیت کو کوئی مدد نہیں ملتی، بلکہ اعلیٰ انسانی اخلاق و کردار کی تخریب کا سامان مہیا کیا جاتا ہے، اس میں نظر صرف ایک ہی سمت رہتی ہے کہ انسان کو ایسا سامان قوت و شوکت حاصل ہو جائے جس سے وہ دوسروں کو دبا کر اپنا فائدہ اٹھا سکے، اسے ایسی صلاحیت اور دانشوری حاصل ہو جائے کہ اپنے خود غرضانہ مقاصد کے لئے سامان ایجاد کر سکے اور اختیار کر سکے۔

مغربی نظام تعلیم کے اس رویہ سے دنیا دو حصوں میں بٹ گئی ہے، ایک کمزور قوموں اور طاقت کے وسائل کم رکھنے والوں کی دنیا، اور دوسری اپنے من مانہ طریقے سے بہتر سے بہتر دریافت کردہ وسائل کو استعمال کر کے اپنی برتری کو مسلط کرنے والوں کی دنیا، چنانچہ ایک طرف سسکتے اور بلبلاتے انسانوں کے گروہ نظر آتے ہیں، دوسری طرف زور، اور یہ سب دراصل نتیجہ خدا ناشناس تعلیم اور تربیت پر انحصار کر لینے کا ہے، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ خدا ناشناس رجحان بڑھتا جا رہا ہے، اور انسانوں کے گروہ در گروہ اس میں شامل ہوتے جا رہے ہیں ایسی صورت میں مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس رجحان کے مقابلہ کے لئے نبوی تعلیمات کے ذریعہ آگے بڑھیں اور

اس کا مقابلہ کریں، وہ امت دعوت ہیں اور ان پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس مقابلہ کے لئے اور غلط رخ کو روکنے کے لئے نظام تعلیم و تربیت کو خدا شناس اور انسانیت کے بلند کردار والی تعلیمات و تدابیر کا حامل بنانا چاہیئے، اس لئے کہ نظام تعلیم و تربیت ہی انسان کی کردار سازی کا سب سے اہم ذریعہ ہے، اس کے لئے انسان کی مادی ضرورتوں کو بڑھا چڑھا کر جو اہمیت دی جارہی ہے اس کے رد میں اعتدال اور حقیقت پسندی اختیار کرنے اور اخلاق و خداترسی کی ذہنیت پیدا کرنے کے وسائل مہیا کرنے کی ضرورت ہے، اور نصاب تعلیم میں اس کو اسی کے لائق جگہ دینی ہوگی، اگر اس طریقہ سے انسانی ضرورتوں کی اہمیت کا جو تناسب انسان کے شایان شان ہے اس کو اختیار نہیں کیا جاتا تو انسانی معاشرہ اپنے بگاڑ اور کرپشن کی آخری حد تک پہونچ سکتا ہے، ترقی یافتہ قوموں کے معاشرہ میں جو جنسی بے راہ روی کے بیشمار واقعات سامنے آرہے ہیں، اور طاقتور کے کمزوروں پر زور دستی کے جو دردناک حوادث پیش آرہے ہیں ان سے شخصی و معاشرتی زندگی کی راہوں میں میدان زندگی ایک خوفناک جنگل کی طرح بنتا چلا جارہا ہے، جس میں اخلاق اور بلند انسانی کردار کی طرف کسی کی توجہ نہیں، اور ہر ایک من مانی زندگی اختیار کرنے والا نظر آتا ہے، ہمارا مشرق بہت حد تک ان باتوں سے محفوظ رہا ہے، لیکن اس نے اب اپنے کو بھی مغرب کے ناخدا شناس راستہ پر ڈال دیا ہے، اور شخصی، اخلاقی اور معاشرتی برتاؤ کے سلسلہ میں اس کو اپنا ہیرو بنالیا ہے۔

یہ بہت خطرناک صورت حال ہے اس کو ہندوستان کے ایک فلسفی نے یورپ کے ایک دانشور کو اس کے یورپ کی عظیم مادی ترقیات کا تذکرہ کرنے پر اپنے ان الفاظ میں ادا کیا تھا کہ ''ہاں آپ لوگ سمندر میں گہرے غوطے لگانے لگے، اور ہوا میں اڑنے لگے لیکن زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں سیکھ سکے''۔

نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کیجئے

بزرگو اور دوستو! میں اس شہر میں پہلی بار حاضر ہوا ہوں، یہاں آکر مجھے خوشی ہوئی، یہاں جو مسلمانوں کا نشاط ہے، اور جو ان کی دلچسپیاں ہیں ان کو دیکھ کر ان سے اچھی امید قائم ہوتی ہے۔

احساس کی ضرورت

صورت یہ ہے کہ ترقی کے لئے سب سے پہلے احساس کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کو اپنی کمزوری کا احساس ہو، اپنی ضرورت کا احساس ہو، اور اس بات کا احساس ہو کہ اس کے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، احساس بڑی چیز ہے، اور احساس ہی کے بعد دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دئے گئے ہیں اور دئے جاتے ہیں، بعض وقت انسان غافل ہوتا ہے، احساس سے خالی ہوتا ہے، اس کی طرف اس کا ذہن ہی نہیں جاتا، اس ضرورت کی طرف اس تقاضے کی طرف یا اس کمی یا کمزوری کی طرف جو اس میں ہوتی ہے، لیکن اچانک کسی واقعہ سے احساس پیدا ہوتا ہے اور پھر انقلاب آجاتا ہے اور وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا واقعہ

حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز مدینہ منورہ کے گورنر تھے، شروع میں تو گورنر

(۱) دار العلوم فرقانیہ سہسرام بہار میں کی گئی تقریر۔

کی حیثیت سے رہتے تھے اور بہت خوش پوشاک تھے، اور خوشبو وغیرہ لگانے کے عادی تھے اور بہت ہی اچھے اور معیاری انداز میں زندگی گذارتے تھے حتی کہ ان کی چال تک لوگوں کو پسند آتی تھی اور ان کے چلنے کے طرز کا نام پڑ گیا تھا "المشية العمرية" یعنی عمر بن عبدالعزیز والی چال، اور لوگ رشک کرتے تھے، لیکن جب ان کو خلافت ملی تو ایک دم سے ان میں تبدیلی آگئی اور وہ بالکل بدل گئے اور اپنی زندگی کو انہوں نے اس طرح بدل دیا کہ ان کے پاس عیش وآرام کا جو بھی سامان تھا سب ترک کردیا اور سب غریبوں کو دے دیا اور بہت ہی معمولی اور تنگی وعسرت کی زندگی اختیار کرلی، تاریخ میں آتا ہے کہ ان کی صاحبزادیاں بہت پریشان رہتی تھی، ان کو کھانے کو ٹھیک سے اور پسند کا نہیں ملا کرتا تھا، ایک مرتبہ جب وہ اپنی بیٹیوں سے ملنے آئے تو دیکھا کہ بیٹیاں اپنے منھ کو ہاتھ سے دبائے ہوئے تھیں، انہوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ معلوم ہوا کہ کھانے کے لئے کچھ تھا نہیں تو پیاز کھا کر گذارا کرلیا اور اس خیال سے کہ والد صاحب کو اس کی مہک سے تکلیف نہ ہو، منھ پر ہاتھ رکھ لیا تھا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رو دئے اور کہنے لگے بیٹیو! اگر تم لوگ چاہو اور اس بات کو پسند کرو کہ تمہیں تکلیف ہو اور تمہارا باپ جہنم سے محفوظ رہے اور جنت میں جائے تو تمہاری عنایت ہوگی یعنی میں تم کو تمہاری پسند کا کھانا دے تو سکتا ہوں لیکن میں اس قابل نہیں ہوں اور نہ میں ایسا کرسکتا ہوں، اور پھر انہوں نے ایسی حکومت کی کہ مثال قائم کردی اور کہنے والے کہنے لگے کہ خلفائے راشدین چار نہیں پانچ ہیں اور پانچویں عمر بن عبدالعزیز ہیں اور یہ عمر بن عبدالعزیز وہ تھے جو پہلے بہت ہی خوشحالی کی زندگی گذارتے تھے بات کیا تھی؟ احساس ہوا جب خلافت ملی تو ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور شدید احساس ہوا اور بالکل ان کی زندگی بدل گئی اور انہوں نے ایک انقلاب برپا کردیا۔

مسلم اقلیت کی ذمہ داری

تاریخ کی بہت ساری شخصیات میں آپ کو یہ بات ملے گی کہ ان میں احساس پیدا ہوا اور تبدیلی آئی اور وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے، تو احساس بہت ضروری چیز ہے، تھوڑا بھی ہو تو اس کا فائدہ ہوتا ہے، اور زیادہ ہو تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے اور ہماری قوم میں اس وقت سب سے زیادہ کمی احساس ہی کی ہے، یعنی ہم اپنے اردگرد دیکھ رہے ہیں کہ دوسری قومیں ترقی کر رہی ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے مقاصد میں لگے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف بہت سی سازشیں ہو رہی ہیں اور گویا کہ سب اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ مسلمانوں کو آگے نہیں بڑھنے دینا ہے اور ان کو پیچھے کر دینا ہے اور اس کے لئے بڑے بڑے پروگرام بن رہے ہیں، اگر آپ میگزین اور اخبارات کا پابندی کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کیسی سازشیں ہو رہی ہیں اور سب کی توجہ مسلمانوں کی طرف ہے کہ اس دنیا سے مسلمانوں کو مٹا دیا جائے یا مٹایا نہ جائے تو ان کو پیچھے کر دیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ان چیزوں کا بہت کم احساس ہے، علم ہی نہیں ہے اور نہ وہ اس کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں نہ اس کی فکر کرتے ہیں اور متعدد قومیں جو اقلیت میں ہیں ایسی ہیں جن کے نام کی صراحت کی ضرورت نہیں کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ ہم اقلیت میں ہیں، اگر ہم دوہری محنت نہیں کریں گے اور اگر ہم پوری توجہ سے کام نہیں لیں گے تو ہم اکثریت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اکثریت کو تعاون اور سرپرستی کے لئے دوسرے وسائل حاصل ہوتے ہیں، لیکن اقلیت بہت سی چیزوں سے محروم ہوتی ہے اور یہ طبعی اور فطری بات ہے اس لئے اقلیت کو دوہری محنت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، اگر وہ دوسروں سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں یا دوسروں کی

سطح پر چلنا چاہتے ہیں تو اس وقت مسلمانوں کو ہمارے اس ملک میں اس کی بڑی ضرورت ہے، وہ یہ سمجھیں کہ ان کو دوہری محنت کرنی ہے اور کن میدانوں میں کرنی ہے؟ اور ان کا احساس صحیح ہو جائے کہ وہ کس پوزیشن میں ہیں اور اس پوزیشن سے نکلنے کے لئے ان کو کیا کرنا چاہئے؟

جنوبی افریقہ میں نسل نو کے ایمان وعقیدہ کیلئے فکرمندی

میں نے جنوبی افریقہ کا سفر کیا اور وہاں کے حالات معلوم کئے تو معلوم ہوا کہ مسلمان وہاں اقلیت میں ہیں، لیکن ان میں سے اکثر پڑھے لکھے ہیں اس لئے کہ ان کو احساس ہے اور اندازہ ہے کہ ان کی پوزیشن کیا ہے، اور ان کو کیا کرنا چاہئے؟ تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ انہوں نے تعلیم کے میدان میں جو تقاضا ہے اور جو ضرورت ہے اس کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے کیا طریقے اختیار کر رکھے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ تعلیم کی کیا اہمیت ہے؟ اس زمانہ میں تعلیم کے بغیر کوئی انقلاب نہیں لایا جا سکتا ہے اور نہ بڑے مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں، اور جو جماعتیں اور قومیں تعلیم میں پیچھے ہیں وہ دنیاوی زندگی میں بھی پیچھے ہیں بلکہ وہ بلند مقاصد کے حصول میں بھی پیچھے ہیں، چونکہ اکثریت دوسروں کی ہے تو ایک تو وہ اسکول اور کالج ہیں جو گورنمنٹ کے ہیں، وہاں حکومت کا نصاب ہوتا ہے، اور دوسری طرف وہ مسلمان اپنے دین کی حفاظت کے لئے مدرسے قائم کرتے ہیں، اس طرح انہوں نے تعلیم کی ضرورت کے جتنے پہلو ہیں، ان تمام پہلوؤں کو اپنے سامنے رکھا ہے۔

ایک تو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ بچہ جب مکتب میں جائے یا اپنے گھر کے ماحول میں ہو تو اس کے دماغ میں عقائد بٹھا دئے جائیں، ابتدائی تعلیم میں یا گھر کی تعلیم میں جو بات سکھا دی جاتی ہے اور بتا دی جاتی ہے وہ دل و دماغ میں راسخ ہو جاتی

ہے اور وہ جڑ پکڑ لیتی ہے پھر بڑی سے بڑی آندھیاں اس کو آسانی سے نکال نہیں سکتیں اور اس کے بہت سے واقعات ہیں یہاں اس کا موقع نہیں ورنہ اس کی مثالیں دی جا سکتی ہیں، گھر کے اندر آدمی جو عقیدہ اور جو رجحان لے لیتا ہے وہ قائم رہتا ہے اور بعد میں مدد دیتا ہے، ایک ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ گھر میں اور گھر کے باہر مکتب میں ابتدائی تعلیم میں اس کے دماغ اور ذہن میں عقائد اور اپنی قدریں جو بنیادی ہیں بٹھادی جائیں اور ان بنیادی قدروں سے تعلق بٹھادیا جائے، حسن سیرت کی ضروری باتیں اس کے دل میں بٹھادی جائیں، اب اس کے بعد وہ جب آگے کی تعلیم میں اگر ایسی تعلیم میں بھی جاتا ہے جس میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی ہم آہنگی نہیں ہے تو بھی اس کا دین اس کے عقائد اور اس کی قدریں بڑی حد تک محفوظ رہیں گی دور نہیں ہونگی۔

دوسرا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے کہ طالب علم جب اسکول وکالج میں چلا جاتا ہے اور وہاں تعلیم حاصل کرتا ہے اکثر بچے گورنمنٹ کے قائم کئے ہوئے مدارس ہی میں جاتے ہیں اس لئے کہ پرائیویٹ طریقے سے اتنا بڑا انتظام نہیں ہوسکتا ہے تو ان کی بھی فکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس کے علاوہ دینی تعلیم کا مسئلہ یہ ہے کہ امت کو جو اعلیٰ دینی مسائل ومعاملات کی ضرورت ہے ان کو وہ علماء پورا کر سکتے ہیں جنہوں نے دین کی پختہ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوتی ہے، تو امت کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ اس کے پاس ایسے علماء ہوں، مفتی ہوں، فقہاء ہوں، اور ائمہ ہوں جو اس کی اعلیٰ دینی ضرورتوں کو پورا کر سکتے ہوں اور یہ بغیر ان کی اچھی تعلیم کے نہیں ہوسکتا ہے، تو ہم نے دیکھا کہ انہوں نے ان ساری باتوں کی رعایت کی ہے، ان کے یہاں ایک تو وہ مدارس ہیں جن کو دینی مدارس کہتے ہیں عربی مدارس کہتے ہیں جہاں علماء تیار کئے جاتے ہیں مفتی تیار کئے جاتے ہیں اور وہ جو دین کی اعلیٰ ضرورتوں کو پورا کر سکتے

ہوں وہ تیار کیے جاتے ہیں، ان کی ایک تعداد بہر حال امت کے لئے ضروری ہوتی ہے اور ہندوستان میں جو بہت سے مدرسے قائم ہوتے ہیں ان پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اتنی تعلیم کی کیا ضرورت؟ لیکن ان کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ دینی تعلیم کے مدرسے جتنے طلبہ کو تعلیم دیتے ہیں ان کی تعداد دو تین فیصد سے زیادہ نہیں، یہ دیکھنے میں بہت معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آپ مجموعی تعداد میں دیکھیں تو ان طلبہ کی تعداد جو اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ دو تین فیصد سے زیادہ نہیں ہیں اور چھیانوے ستانوے فیصد طلبہ وہ ہیں جو دوسرے اسکولوں اور مدارس اور کالجوں میں جاتے ہیں اور دوسری طرح سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، تو ہماری اعلیٰ دینی ضرورت کے لئے کیا یہ دو تین آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے؟ بہت ضرورت ہے، یہ نہیں کہ آپ سب کو اعلیٰ دینی تعلیم دیں لیکن کم از کم دو تین فیصد کو تو آپ کو دینا ہی چاہئے تاکہ آپ کی اعلیٰ علمی ضرورت اور آپ کی دینی ضرورت پوری ہو، ظاہر ہے کہ دو تین فیصد کو اگر آپ دین کی اعلیٰ تعلیم دیدیں تو اس سے امت کا کام نہیں چلے گا اور وہ تعلیم جس سے دنیا کے اندر ترقی حاصل ہوتی ہے اور دنیاوی بلند مقاصد حاصل ہوتے ہیں وہ بھی بہت ضروری ہے اس کے لئے اسکول و کالج قائم ہوتے ہیں اور وہ اسکول و کالج جو اکثریت اور حکومت کی طرف سے قائم ہوتے ہیں اس میں اسلام اور مسلمانوں کی رعایت نہیں ہوتی بلکہ عام طور پر اس سے نقصان پہونچتا ہے لیکن وہ ایک ضرورت ہے جس سے صرف نظر نہیں کر سکتے، تو انہوں نے اس کے لئے یہ انتظام کیا ہے کہ اس کے متوازی اسکول و کالج قائم کئے جس کو ہم ہندوستان میں اسلامیہ کالج اور اسکول کہتے ہیں انہوں نے اس کو مسلم اسکول اور مسلم کالج کے نام سے کھولا ہے، اس میں گورنمنٹ کا نصاب ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کی رعایت ہوتی ہے جس کی مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے ان علوم کو حاصل کرے، تو ایسے مسلم کالج قائم کرنے میں ان کو

اس میں خرچ کرنا پڑتا ہے وہ پرائیویٹ ہوتے ہیں لیکن وہ ساری تعلیم دیتے ہیں جو گورنمنٹ کی طرف سے دی جانی چاہئے سائنس کی اور دوسری چیزوں کی، تیسرے انہوں نے یہ انتظام کیا ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں جو بچے اسکول وکالج جاتے ہیں جن کو روک بھی نہیں سکتے اور روکنا بھی نہیں چاہئے ان کے لئے انہوں نے ایک الگ سے اچھا انتظام کیا ہے اور ہائی اسکول تک انتظام کیا ہے جو بالکل گورنمنٹ کے اسکولوں کے متوازی ہے اس میں کلاسوں کا نظام بھی متوازی ہے اور وہ شام کے وقت چلتے ہیں، یعنی صبح سے لے کر دوپہر تک عام طور پر وہاں اسکول وکالج اور تعلیم کے سارے مراکز چلتے ہیں، وہاں تین چار بجے سے چھ سات بجے تک یہ اسکول چلتے ہیں، اور بہت سے پڑھنے والے طلبہ یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے ہیں، باقاعدہ داخلہ ہوتا ہے اور ان سارے مضامین کے لحاظ سے تعلیم ہوتی ہے جو وہاں اسکول وکالج میں ہوتی ہے اور یہ اضافی ہوتی ہے تاکہ ان کو ان کے دین سے وابستہ رکھا جائے اور دین کے اعتبار سے ان کو کوئی نقصان نہ ہو۔

ہم نے خود دیکھا ہے ایسے اسکولوں کو کہ طلبہ ظہر کے بعد سارے کے سارے اسی تعداد میں آتے ہیں اور یہاں کلاسیز لگ جاتے ہیں، وہ وہاں درجوں میں حاضری کے بعد یہاں کلاسیز میں بیٹھتے ہیں، اس طرح اپنے مذہبی شعائر اور اپنی مذہبی معلومات سے ان کو واقفیت ہوتی ہے، اور چوتھا انتظام بالکل مکتب اور ابتدائی تعلیم کا انہوں نے کیا ہے وہ اس میں عقائد اور اسلامیات کی تعلیم دیتے ہیں تو جب اس کی بنیاد مضبوط ہو جائے گی اور بنیادی طور پر جب اس کے عقائد درست ہوں گے تو اس کو زیادہ نقصان نہیں پہونچے گا، یہ انتظام انہوں نے چار قسموں کا کیا ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں اور وہاں جو مسلمانوں کی نسل ہے جو عام طور پر ہندوستانی اور پاکستانی ہے لیکن وہ تاجر ہیں، کاروباری ہیں، انہوں نے اپنے لڑکوں کی دینی حفاظت کے لئے

یہ انتظام کیا ہے اور اس پر وہ پورا خرچ کرتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کیلئے لمحہ فکریہ

ہمارا ملک اس معاملہ میں جنوبی افریقہ سے بڑی مشابہت رکھتا ہے، ہم کو بھی اس بات کی فکر کرنی چاہئے کہ ایک تو یہ کہ جو بالکل ابتدائی اور گھر سے نکل کر مکتب کی تعلیم ہے اس میں ہم اسلام کے صحیح عقائد اپنے بچوں کے دلوں اور ذہنوں میں اتار دیں اور ان کو اسلامی قدروں سے واقف کرادیں تا کہ ان کو کوئی خطرہ پیش نہ آے ورنہ وہ پہلے مرحلہ میں جب شرک وکفر کی باتیں سنیں گے تو وہی ان کے دلوں میں راسخ ہو جائیں گی اور یہ سمجھئے کہ زندگی بھر وہ راسخ رہیں گی، اور اس کا وبال انہیں کو نہیں ہوگا بلکہ ان کے ماں باپ کو بھی ہوگا، اور اب تو ہم دیکھتے ہیں وہ وبال صرف دینی وبال نہیں بلکہ وہ وبال اور مصیبت سیاسی طور پر بھی اور معاشی طور پر بھی اور ثقافتی طور پر ہوتی ہے، آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا حالات ہیں کہ ہم اپنے دین کی طرف سے اگر غافل ہوتے ہیں اپنی نسل کو دین سے واقف نہیں کراتے ہیں تو ہم کو صرف مذہبی نقصان نہیں پہونچتا بلکہ کئی جہت سے نقصان پہونچتا ہے، سیاسی میدان میں بھی ہم کو نقصان پہونچتا ہے اپنے دین سے دور ہونے کی وجہ سے اقتصادی اور اسی طرح دوسرے میدان میں بھی نقصان پہونچتا ہے۔

ہمیں بحیثیت امت کے اپنی خصوصیات کو باقی رکھنا ہے ورنہ ہم بالکل گھل کر ختم ہو جائیں گے چاہے نام وہی رکھیں اس کے علاوہ اور کوئی چیز باقی نہیں رہے گی، اور نام بھی کب تک باقی رہ سکتا ہے؟ جب کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہے گی نام بھی ختم ہو جائے گا جیسا کہ دنیا کے کئی ملکوں میں ایسا ہو چکا ہے جو لوگ موجودہ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ کئی ملک ایسے ہیں کہ جہاں اب نام بھی باقی نہیں رہا اور

پہچاننا مشکل ہے کوئی فرق نہیں، نہ وہ فرق سمجھتے ہیں، البتہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے دادا مسلمان تھے، ایک جگہ کے متعلق ہے جہاں اس وقت مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن ایک صاحب نے کسی جاننے والے سے کہا کہ ہم مذہبی آدمی ہیں، کہا کہ اچھا آپ مذہبی آدمی ہیں؟ یعنی وہ بتارہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان جیسا ہوتا ہے ہم ویسا کرتے ہیں تو انہوں نے پوچھا کیسے؟ وہ کہنے لگے کہ جب ہم صبح کو اٹھتے ہیں تو فلاں دعا پڑھ لیتے ہیں، دو چار عربی کے الفاظ تھے وہ انہوں نے بتایا کہ ہم پڑھ لیتے ہیں ان کو اس کے علاوہ کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسلام کیا ہے؟ دو تین چار عربی کے الفاظ ان کو کسی نے بتادیئے تھے وہ ان کو صبح کے وقت پڑھ لیا کرتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، نام بھی مسلمان کا نہیں، اعمال بھی مسلمان کے نہیں، تو یہ تو فطری نتیجہ ہے اگر ہم نے احساس نہیں کیا اپنے نقص کا کہ ہم بہرحال اقلیت میں ہیں، اقلیت میں ہونا بھی ایک نقص ہے لیکن اس نقص کی تلافی ہوسکتی ہے اس کی تلافی کے ذرائع ہیں، یہ نقص ایسا ہے کہ اس کی تلافی ہوسکتی ہے، ہم کو اس بات کی فکر کرنی ہے کہ تعلیم کے معاملہ میں ہمیں وہ ساری اقسام اختیار کرنی پڑیں گی جن کا ہم نے ذکر کیا، اس لئے کہ جدید تعلیم جس کے بغیر ہم دوسری قوموں اور دوسرے ہمسروں کا مقابلہ نہیں کرسکتے ہیں وہ لازمی اور ضروری ہے لیکن اس کو حاصل کرنے میں ہم کو جو دینی نقصان ہوسکتا ہو اس کی بھی فکر کرنی ہوگی اور اس کی تلافی کرنی ہوگی اس کے لئے الگ سے انتظام کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ مکتب کی تعلیم میں ہمیں اس کی زیادہ رعایت کرنی ہوگی کہ ہمارا بچہ شروع سے دین سے ناواقف نہ ہو، اس لئے کہ شروع سے اگر اس کے دماغ میں مشرکانہ عقائد بٹھادئے جائیں یا مشرکانہ قدریں اس کے ذہن میں اتاردی گئیں تو آسانی سے انہیں نکال نہیں سکتے، ہمیں اپنے گھر کے ماحول اور گھر کے جو انتظامات ہوتے ہیں ان میں بھی اس کی فکر کرنی ہوگی اور مکتب کی تعلیم جیسے پہلے اس کا ایک

انتظام تھا اور اب اس کا انتظام دوسری شکل میں ہو سکتا ہے، پہلے یہ تھا کہ بچہ جب گھر سے باہر نکل سکتا تھا تو مسجد میں باہر کے مولوی سے الف با اور پارہ عم وغیرہ پڑھ لیا کرتا تھا، ور کچھ دینی قدریں اور دینی عقائد ہیں وہ جا کر مسجد میں مولوی صاحب سے سیکھ لیا کرتا تھا اور پھر اس کی تعلیم شروع ہوتی تھی اب یہ سب ختم ہو گیا، اب ہمارے بچے کی تربیت کون کرتا ہے؟ ٹیلی ویژن کرتا ہے اور بچہ ذرا بڑا ہو جاتا ہے تو اخبارات ورسائل کرتے ہیں اور یہ بتانے کی ضرورت ہے ہی نہیں کہ ٹیلی ویژن کیا سکھاتا ہے؟ اور آج کل ہم لوگ جو یہ سوچتے ہیں کہ ہمارا بچہ ہماری طرح ہوگا تو ایسا ممکن نہیں، یہ نہیں کہ وہ کوئی معدنی چیز ہے کہ جیسے کان سے نکلا ویسے ہی رہے گا یہ انسان ہے، انسان پر تربیت وتعلیم کا بہت اثر پڑتا ہے جس ماحول میں اور جس طریقۂ تعلیم میں اور جن مقاصد کے ساتھ اس کو سکھایا پڑھایا جائے وہی اس کو آئے گا، تمناؤں سے کام نہیں چلے گا، ہمارا بچہ ہمارے جیسا کیا ہمارا مخالف بھی ہو سکتا ہے ہمارا برعکس ہو سکتا ہے کہ بعد میں اس کو دیکھ کر سوائے کڑھن کے اور سوائے افسوس کے اور کچھ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا اس کا خطرہ ہے اگر ہم نے شروع سے انتظام نہیں کیا، اور انتظام کا مطلب میرا یہ نہیں ہے کہ دینی تعلیم دی جائے، نہیں، بلکہ جو کمی اور نقصان ہو سکتا ہے عصری اور جدید تعلیم سے، ظاہر ہے کہ وہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے وہ تو اکثریت کے اختیار میں ہے، اس میں ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اس سے جو نقصان ہو سکتا ہے اس نقصان کی ہم فکر کریں اور اس کی تلافی کے انتظامات کریں اور یہ بغیر احساس کے نہیں ہو سکتا ہے، احساس کی بڑی ضرورت ہے، ہم سمجھیں اپنی پوزیشن کو، اپنی کمی کو اور اپنے مستقبل کو بھی سوچیں کہ مستقبل میں کیا ہونے جا رہا ہے اور پھر اس کے مطابق ہم فکر کریں تو ان شاء اللہ ہم اس پوزیشن میں ہوں گے کہ دوسروں سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور ہم دوسروں سے پیچھے نہیں رہیں گے بلکہ ہم دوسروں سے بہتر رہیں گے، اس لئے

کہ ہماری جو قدریں ہیں وہ بڑی اعلیٰ ہیں وہ انسانیت کو بھی فروغ دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ صلاحیتیں پیدا کرتی ہیں جو دوسری قدروں سے پیدا نہیں ہوتیں، اس میں ایثار پیدا ہوتا ہے اس میں اپنے پروردگار کی مرضی کے مطابق محنت اور جدوجہد کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس میں خودغرضی نہیں رہتی، اس میں انسانیت نوازی ہوتی ہے، دوسری قدروں میں یہ چیزیں نہیں ہوتی ہیں۔

بچپن کا نقش، نقش کالحجر ہوتا ہے

تو جب ہم کسی مدرسہ یا کسی اسلامی اسکول کو دیکھتے ہیں تو یہ باتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں اور ہم اس اسکول و مدرسہ کی بہت قدردانی کا اظہار کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ ایک بیج ہے، اس سے ایک تناور درخت پیدا ہوسکتا ہے بعض وقت ایک چھوٹی سی چیز انسان کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے، مصر کے ایک بڑے ادیب ہیں جن کا ادب میں طوطی بولتا تھا، دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، ادب پر کتابیں لکھتے تھے، ادب پر لکچر دیا کرتے تھے اور ادب ہی کی تعلیم دیتے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ ادیب کا دیندار ہونا ضروری نہیں ہوتا، انہوں نے قرآن کے اعجاز پر ایک کتاب لکھی، لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا پھر انہوں نے یہ کتاب کیسے لکھی؟ جب اس کا مقدمہ میں نے پڑھا اس میں لکھا تھا کہ میں اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوتا تھا اور ماں قرآن مجید کی تلاوت کرتی تھیں مجھے ان کی تلاوت اچھی لگتی تھی اور وہ چیز میرے دل میں ابھی تک موجود ہے اور اسی نے مجھ کو آمادہ کیا کہ قرآن مجید کی بلاغت اور اس کے اعجاز پر کتاب لکھوں، آپ سوچئے کہ یہ کس زمانہ کی بات ہے؟ جب وہ نہ بول سکتے ہونگے، ماں کی گود میں ہونے کا کیا مطلب ہے، لیکن وہ جو بیج پڑ گیا تھا، تناور درخت بن گیا پھر وہ مجاہد اور بڑے دیندار ہو گئے اور انھوں نے اپنی زندگی دین کے

لئے صرف کردی اور یہ سب کچھ ان کی کتاب کے اس مقدمہ سے پتہ چلا، تو آپ اس کو معمولی نہ سمجھئے، گھر کے اندر آپ بچے کے دل میں جو بیج ڈال دیں گے اور پھر مکتب میں اس کو جو سکھا دیں گے وہ زندگی بھر اس کا ساتھ دے گا، اس کو معمولی چیز مت سمجھئے، لیکن ضرورت احساس کی ہے کہ ہم سمجھیں کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں، اگر ہم اس پوزیشن پر راضی رہے اور ہم نے کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی تو مستقبل کی بات یہ ہے کہ وہ بڑا ظالم ہوسکتا ہے وہ بالکل مروت نہیں کرے گا، جس راستہ سے آدمی گذرے گا اس راستہ کے اثرات اس پر پڑیں گے، ہماری تمنا سے نہیں ہوگا، ہم چاہیں کہ ہمارا بچہ یہ ہوجائے وہ ہوجائے، اس سے نہیں ہوگا، ایسا کرنے کے لئے ہمیں انتظامات کرنے ہوں گے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارا بچہ بڑا انجینئر ہوجائے تو آپ کو ویسی ہی تعلیم پڑھانی پڑے گی اور ویسی ہی اس کو اعلیٰ تعلیم دینی ہوگی جب ہی وہ انجینئر بنے گا، آپ کی تمنا سے نہیں بنے گا، آپ چاہیں کہ آپ کا بچہ نیک اور صالح بنے تو اس کے لئے آپ کو اس کا انتظام کرنا ہوگا، لیکن یہ انتظام کب ہوگا جب ہم کو احساس ہو کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں؟ اور اس پوزیشن سے ہم اپنے کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں؟ اس کے جو طریقے ہیں اور لوگوں نے جو تجربے کئے ہیں ان تجربوں سے فائدہ اٹھا کر ہوسکتا ہے، تو ان مکاتب و مدارس کو بھی آپ کمتر نہ سمجھئے، ان کو سمجھئے کہ یہ ایک ضرورت پوری کر رہے ہیں کل ضرورت پوری نہیں کر رہے ہیں یہ سب جانتے ہیں، لیکن ایک ضرورت پوری کر رہے ہیں، اور ان کا ایک کردار ہوگا اور یہ امت کو فائدہ پہونچائیں گے، لیکن عام تعلیم کے اندر ایک مسلمان کی حیثیت سے جو کمی رہ سکتی ہے اس کی تلافی آپ کو کرنی ہوگی، اس کے لئے انتظام کرنا ہوگا، چاہے آپ اصل میں نہیں کرسکتے ہیں تو اس کے ایک پہلو کے لحاظ سے آپ کریں گے، اس لئے کہ اس وقت ہمارے ہاتھ پاؤں گویا کٹے ہوئے ہیں، ہمارے گھروں میں جو تربیت ہورہی ہے وہ ہماری مرضی کے خلاف

ہو رہی ہے ٹیلی ویژن سے جو تربیت ہوگی اور ہو رہی ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ٹیلی ویژن پر جو کچھ دکھایا اور بتایا جاتا ہے وہ ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے، نہیں، بلکہ وہ اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے اور بچوں کے اوپر تو بہت زیادہ نقش چھوڑتا ہے اس لئے کہ اس کا دل کھلا ہوا ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جونئی ہوگی اور اس کو ملے گی اس کو وہ قبول کرے گا، ہم اگر اس کو روک نہیں سکتے ہیں تو اس کے علاج کے طور پر ہمیں ایک چیز اختیار کرنی پڑے گی، آپ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ جب دوائیں دیتے ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ جو دوائیں دیتے ہیں ان سے سائڈ ایفکٹ بھی ہوتا ہے تو اس کو دور کرنے کے لئے بھی دوائیں دیتے ہیں تو ہمیں بھی یہی کرنا پڑے گا کہ جو تعلیم کا نظام ہے اس سے ہم بچ نہیں سکتے، لیکن ہمیں سائڈ ایفکٹ (Side Effect) سے اپنے بچوں کو بچانا ہوگا لیکن یہ کب ہوگا جب ہمیں اپنی ضرورت کا احساس ہو تو تعلیم کے سلسلہ میں جو انتظام ہو چاہے مدرسہ ہو، چاہے مکتب ہو، چاہے اسکول ہو جس میں اسلام اور مسلمان کی رعایت ہوتی ہو ان تمام کی قدر کرنے کی ضرورت ہے اور تعاون کرنے کی ضرورت ہے۔

❖ ❖ ❖

موجودہ حالات میں دینی تعلیم کی ضرورت واہمیت (۱)

ہمارا یہ اجتماع جو مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے شمالی ہند کے اس معروف شہر گورکھپور میں منعقد ہو رہا ہے، گورکھپور میں باشعور مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، کوئی قوم بھی اگر اپنے اچھے برے کا صحیح شعور رکھتی ہو تو اس کو اپنی ملی ضرورت وحیثیت اور اعلیٰ قدروں کے مطابق زندگی کو استوار کرنے میں کوئی بڑی دشواری پیش نہیں آتی، زندگی کے اصل معاملات کی صحیح ادائیگی کے لئے دراصل ضرورت صحیح شعور کے پیدا ہونے کی ہوتی ہے اس کے اثر سے مشکل حالات میں بھی آدمی اپنی راہ بنا لیتا ہے، ہندوستان میں بدیسی سامراج کے بااثر طاقت بننے اور کامیابیاں حاصل کرنے میں ہماری اس کوتاہی کا زیادہ اثر پڑا تھا کہ بدیسی غلبہ کے مضبوط ہو جانے کے بعد اس کی چیرہ دستیوں کا صحیح شعور اس ملک کے باشندوں میں پیدا ہوا تھا، اور وہ شعور ایسا زیادہ نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کے ذہنوں پر پوری طرح اثر انداز ہو۔

ہندوستان کو جب آزادی ملی تو یہ آزادی زندگی کے سیکولر ڈھانچہ کے اندر ملی، لیکن یہاں کی اکثریت اور اقلیت کے درمیان فرقہ وارانہ احساسات کے بڑے پیمانہ پر

(۱) خطبۂ صدارت دینی تعلیمی کونسل کانفرنس، منعقدہ ۱۴؍ اکتوبر ۲۰۰۳ء، گورکھپور۔

اثر انداز ہونے سے سیکولر اصولوں پر عمل کمزور رہا، اور اس کے نتیجہ میں بالا دست فریق کی طرف سے کمزور اور کمتر حیثیت کے فریق پر اپنے فرقہ وارانہ جذبات واحساسات کے باعث تفوق اور تصرف کا عمل رہا، جس سے مسلمان اقلیت کو فوری طور پر تو نقصان ہوا ہی، مزید آگے کے لئے بھی نقصان کی راہ بنی، یہاں اس ملک میں مسلمان ایک وقیع تعداد میں ہونے اور اپنی ملی اور دینی ضرورتوں میں خود کفیل ہونے کی وجہ سے اس بات کی پوری صلاحیت رکھتے تھے کہ اپنے ملی معاملات کو اپنے عوامی وسائل کے ساتھ انجام دیں، اور اپنے ملی تشخص کو اور مذہبی تحفظ کو قائم رکھیں، لیکن ایسا کرنے میں بالا دست فریق کی طرف سے لائی جانے والی رکاوٹوں کا دور ہونا ضروری تھا، جو اس عمل میں حارج ہوتی ہیں، اسی کے ساتھ اہم بات یہ بھی تھی کہ کسی بھی بڑے کام کو انجام دینے کے لئے اس کی اہمیت اور اس کی راہ کی رکاوٹوں کے متعلق صحیح شعور پیدا ہو، چنانچہ آزادی ہند کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی، اور اس کے جو اثرات ملی اور مذہبی تحفظ پر پڑنا شروع ہوئے تھے، اس کو مسلمانوں کے باشعور طبقہ کے صرف محدود افراد نے محسوس کیا، اس کا اہم پہلو نئی نسل کی تعلیم کا اسلامی عقائد وتعلیمات سے ٹکراؤ در وکرنا تھا، اس کی فکر کرنے میں ہمارے وسط ہند کے علاقہ کے دائرہ میں قاضی عدیل عباسی صاحب کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس سلسلہ میں قاضی صاحب نے یہ نظام بنایا کہ کم از کم آغاز عمر کی نسل کے ذہنوں کو غیروں کے عقائد ورجحانات میں ڈھل جانے سے روکنے کے لئے منفی انتظام کے بجائے مثبت انتظام کی طرف توجہ کی جائے، چنانچہ آٹے کی چٹکیوں کی بنیاد پر دینی تعلیم کا انتظام کیا، اور اپنے ضلع بستی سے اس کا آغاز کیا، اور کوشش کی کہ گاؤں گاؤں یہ انتظام پھیلے، اور جہاں دور تک جاسکے وہاں پہنچایا جائے، اس میں ان کو متعدد مخلص رفقاء کار ملے، اور ان سب نے مشورہ سے اس نظام کو ترقی دی، اور الحمد للہ اس نظام نے بڑا اثر ڈالا، اور اس کی افادیت کو سب نے تسلیم کیا، اور آج ان کے قائم کردہ

اس نظام کے تحت جو دینی تعلیمی کونسل کے نام سے موسوم ہے، اور اس کی ضلعی شاخیں انجمن تعلیمات دین کے نام سے نصف صدی کے قریب تک پھیلی ہوئی تاریخ میں اپنی کوششوں کے نتائج کی ایک فہرست رکھتی ہیں، اور ملک کے جو حالات ہیں ان میں اپنی افادیت اور ضرورت کو برابر ثابت کر رہی ہیں، اور ان کی کامیابی کی مقدار کو سامنے رکھتے ہوئے امت کے اس شعور کا اچھا اظہار ہو رہا ہے کہ امت کو اپنے ملی اور مذہبی تحفظ کی ضرورت کا احساس ہے۔

اس وقت ہم جب ملت کی باعزت اور قدوروں کی حامل زندگی کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں، اور ہماری دینی تعلیمی کونسل جو اپنے تجربات و مشاہدات پر نظر ڈالتی ہے تو ہمارے شعور میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ اس ملک کے مسلمانوں کے اپنے ملی تشخص کے بقا کے حالات میں ہمیں بڑی سنگینی نظر آتی ہے اسی کے ساتھ مسلمانوں کے ملی شعور میں خاصی کمی نظر آتی ہے، دینی تعلیمی کونسل کوئی حکومتی ادارہ نہیں ہے، وہ ایک عوامی ادارہ ہے، اگر عوام کی طرف سے اس کی پوری ہمت افزائی نہیں ہوتی اور اس کو جس طاقت کی ضرورت ہے اس کو وہ طاقت اپنی ملت سے پوری پوری حاصل نہیں ہوتی تو وہ جو بھی پروگرام بنائے، اور جو بھی نظام طے کرے وہ ملت کی ضرورت کو زیادہ پورا نہیں کر سکتا، اور جب کہ اس ملک میں فرقہ وارانہ منفی ذہنیت کی وجہ سے بڑے نقصانات سامنے آرہے ہیں، اور ملت کی زندگی کی اعلی قدروں میں تبدیلی پیدا کئے جانے کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے، ایسی صورت میں اس کام کی اہمیت بہت زیادہ سامنے آرہی ہے، اور اس کو عوام میں تقویت ملنے میں کمی پائے جانے سے افسوس ہوتا ہے، اور مستقبل کے خطرات کا احساس بڑھ جاتا ہے، گزشتہ زمانہ میں جب اس ملک میں مسلمانوں کا وقار اور عزت اپنے صحیح مقام پر تھی اور ان میں اپنی ملی قدروں کا احساس بھی عام تھا تو مسلمانوں کی آغاز عمر کی نسل کا نشو و نما ان کے بڑوں کی توجہ کے ساتھ ہوتا تھا اور

وہ مناسب تربیت پاتی تھی، وہ یہاں پھیلے ہوئے عقیدۂ شرک سے اجتناب کے ساتھ اور خدائے واحد کی عظمت اور اس کی صحیح تابعداری کے احساس کے ساتھ اور امت مسلمہ کے صحیح عقائد ورجحانات کے مبادی سے واقفیت اور ان پر یقین کے ساتھ پروان چڑھتی تھی، گھروں میں اور گھروں کے باہر مسجدوں میں اس نئی نسل کو آغاز عمر ہی سے صحیح ذہنی غذا ملنا شروع ہو جاتی تھی، جس کے انجام دینے والے گھر کے بزرگ اور بوڑھے افراد ہوتے تھے، اس کے ساتھ مسجدوں کے امام ومؤذن حضرات سے مدد لی جاتی تھی، یہ سلسلہ جدید ہندوستان میں اب موقوف ہو چکا ہے، اور اس کا کوئی متبادل سلسلہ باقاعدہ قائم نہیں ہو سکا، اب صرف نئی نسل کے وہی بچے ان خطرات سے محفوظ ہو پا رہے ہیں جو علوم دینیہ کے مدارس میں بھیجے جاتے ہیں، لیکن ان کی تعداد سو میں تین چار سے زیادہ نہیں، باقی تعداد دینی اقدار کے لحاظ سے برباد ہو رہی ہے، کیونکہ گھروں میں وہ سابق نظام باقی نہیں رہا، اور اس کے بجائے بازاروں کی اشتہاری دنیا اور روزانہ اخبارات کی طرف سے غیر محتاط رخ دینے اور پھر ٹی وی کے پروگرام جن سے ہمہ دم سابقہ پڑتا ہے، وہ نئی نسل کو کس خطرناک تغیر کی طرف لیجا رہے ہیں اس کا اندازہ سب کر سکتے ہیں، ایسی صورت میں اگر ہم ان حالات کو بدل نہیں سکتے، کیونکہ یہ ملک کی قومی زندگی میں اس طرح سرایت کر گئے ہیں جس طرح پانی میں کسی رنگ کی آمیزش سے رنگ سرایت کر جاتا ہے تو کم از کم ہم اس کا کچھ بدرقہ اختیار کر سکتے ہیں، اور وہ بدرقہ ہمارے یہ ابتدائی تعلیم کے اسلامی پرائمری مدارس ہیں جو دینی تعلیمی کونسل اور اسی جیسے عوامی اداروں کی سربراہی میں عوامی وسائل سے چلائے جاتے ہیں، ان میں قومی اسکولوں میں دی جانے والی ذہنی تشکیل کی غذا سے جو ایک مسلمان کو اپنی ملی اور دینی قدروں سے ہٹانے والی ہے سابقہ پڑنے سے پہلے ہی مسلمان بچوں کو اپنے خدائے واحد اور رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے متعارف کرایا جائے، اور ان سے ان کا مذہبی اور عقائدی رشتہ قائم

کیاجائے کہ وہ اپنے عقائد کوغیروں کے عقائد کے سامنے تحلیل ہونے سے بچا سکیں۔

مسلمانوں کے لئے مذہب کے سلسلہ میں یہ جاننا اور ماننا ضروری ہے کہ ان کا مذہب توحید کا مذہب ہے، جس میں خدا کو ایک ماننا اور تنہا اسی کی بندگی کرنا ضروری ہے، وہ شرک کی کسی قسم وشکل کو قبول نہیں کرتا، نیز یہ کہ مذہب اسلام بالکل کامل ومکمل مذہب ہے، زندگی کے تمام معاملات میں وہ خیر خواہانہ رہنمائی کرتا ہے، اس کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان ہی تعلیمات کے لئے بھیجے گئے، ان کی تابعداری اور ان کے احکام پر عمل ضروری قرار دیا گیا، اسلام میں یہ جاننا اور ماننا بھی ضروری قرار دیا گیا کہ انسانوں کی موجودہ زندگی کے بعد دوسری زندگی ہوگی، جس کو آخرت کہتے ہیں، جہاں ہماری اس دنیا کی زندگی میں کئے گئے ہمارے اچھے اور برے کاموں کا بدلہ ملے گا، اسلام کوئی زبردستی کا مذہب نہیں ہے وہ کسی پر زبردستی کر کے اپنے کو ماننے پر مجبور کرنے کو نہیں کہتا وہ اچھی باتوں کی طرف دعوت دیتا ہے، اور سب انسانوں کے ساتھ خواہ گورے ہوں یا کالے، امیر ہوں یا غریب، سب کے ساتھ برابری کا معاملہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

اسلام نے ہم کو جو تعلیمات دیں ان کا جاننا اور ماننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے چنانچہ ہم کو اس ملک میں جہاں طرح طرح کے عقیدے اور مذاہب ہیں، اپنی نئی نسل کے ذہنوں کو ان کی عمر کے آغاز ہی میں اسلام کے صحیح عقیدہ وعمل سے واقف کرادینا ضروری ہے، تاکہ وہ اپنے صحیح راستہ سے بھٹکنے سے محفوظ رہیں، ہماری دینی تعلیمی کونسل کی ساری جدوجہد یہی ہے، اور اس کے لئے یہ کونسل لوگوں کو متوجہ کرتی ہے، اور اپنے وسائل سے پرائمری تعلیم کے کلاس پانچ تک کے وقت میں اپنے نظام کو قائم کرتی ہے، تاکہ جب بچہ کلاس چھ میں تعلیم کے قومی نظام میں شامل ہو تو اس کے عقائد اور دینی بنیاد صحیح قائم رہ سکے، اور وہ اپنے کو مسلمان ملت کا فرزند سمجھے، اور اپنی

بنیادی قدروں سے آشنا ہو، اس میں اس کو دھوکہ کھانے سے اور غیروں کے مخالفانہ اثرات سے محفوظ رہنے کا راستہ مل جائے گا۔

ہماری دینی تعلیمی کونسل نے اپنے نظام میں صرف یہی نہیں کیا کہ بچوں کے صحیح ملی اقدار کے تحفظ کے لئے انتظام کیا بلکہ حالات کا بھی برابر جائزہ لینے کا انتظام رکھا کہ ملک کے سیکولر ڈھانچہ میں جس کو دستور نے مقرر کیا ہے، اور جس کی پابندی اقلیت اور اکثریت اور حکومت وعوام سب کو کرنا ضروری ہے، اس میں چور دروازوں سے عملی سطح پر کیا اقدامات کئے جاتے ہیں؟ اس کا مقابلہ ہماری کونسل اپنے ماہرین تعلیم اور واقفین دستور کی ہوشمندی کے ذریعہ کرتی رہتی ہے، اور دستور اور سیکولرازم کے حوالہ سے اس کو روکنے کی کوشش کرتی ہے، اور الحمدللہ اس کو متعدد خطرات کو دور کرنے کا موقع ملا، بندے ماترم کا مشرکانہ عمل روکنے میں کامیابی حاصل کی، قومی تعلیمی اداروں میں سرسوتی پوجا اور نصاب درس میں ہندو دیو مالا کے ایسے مضامین جو اقلیت کے عقائد کو بگاڑنے والے ہیں، ان کو اقلیت پر عائد نہیں کیا جا سکتا، ان کے بدلنے کے لئے کونسل نے کوششیں کیں، اور کئی بار کامیابی حاصل کی، اور کونسل کے ذمہ دار برابر اس کام میں لگے ہوئے ہیں، اور اس میں ان کو ملت کے باشعور حضرات کے بڑے تعاون کی ضرورت ہے۔

ہماری رہنما شخصیتوں کے یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو جانے سے پہلے ہم کو صرف کارگذار افراد کی کمی ہی محسوس ہوتی تھی لیکن اب رہنما شخصیتوں کی کمی بھی محسوس ہونے لگی ہے، سکریڑی جنرل وبانی تحریک قاضی عدیل عباسی صاحب اور کونسل کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور دونوں کے ممتاز رفیق کار ومشیر مولانا محمد منظور نعمانی، اور قاضی صاحب کے بعد کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی صاحب، اور اس تحریک کے اولین اہم رفقاء کار وکیل ظفر احمد صدیقی اور کونسل کے سابق ناظم مولانا محمود الحسن عثمانی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قائدانہ اور

مدبرانہ توجہ اور فکر سے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور مضبوط کیا، وہ آج ہم میں نہیں ہیں، لیکن دنیا کے آغاز سے یہی دستور رہا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی اہم اور کارگزار ہو وہ ایک مدت گذارنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ رخصت ہونے والے کی جگہ نئے باہمت لوگ لیتے رہیں، اور یہ سلسلہ جتنا قائم رہے گا اتنا ہی کام کا سلسلہ بھی قائم رہے گا، اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس تحریک کو مردان کار برابر ملتے رہیں، اس کے برعکس ہمارے مشاہدہ میں یہ بات آرہی ہے کہ تحریک کو جتنے افراد کی ضرورت ہے اور اس کام کی اہمیت کا احساس اور ملت کی ضرورت کا شعور جتنا مطلوب ہے اس سے بہت کم حاصل ہو رہا ہے، ایسا بڑا کام صرف گنے چنے محدود چند افراد جو وسائل کی بڑی کمی کے باوجود اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ ایسے اہم کام کی عظیم ذمہ داری کو اپنے محدود طاقت عمل سے پوری طرح سے انجام نہیں دے سکتے، مسلمانوں میں پڑھے لکھے اور باشعور افراد کی کمی نہیں ہے، ضرورت ہے کہ وہ اس کام کی اہمیت کو اپنے سامنے لائیں، اور جو تعاون ان سے ہو سکتا ہو کریں۔

❖ ❖ ❖

مدارس کی حیثیت پاور ہاؤس کی ہے
ان کی خصوصیات کو ختم کرنے کی کوشش ایک سازش ہے [۱]

اس وقت پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بلکہ خود انسانیت کے خلاف زبردست سازش چل رہی ہے، انسانیت کی قدروں کو ختم کیا جارہا ہے، انسان دوسری مخلوقات پر انسانیت کی وجہ سے امتیاز رکھتا ہے، اس لئے سازش ہے کہ انسانی قدروں کو ختم کر کے انسان کو حیوان بنا دیا جائے، کتا اور بلی بنا دیا جائے، زبان سے یہ بات نہیں کہی جاتی، لیکن میڈیا کے ذریعہ جو حالات پیدا کئے جارہے ہیں، ٹیلی ویژن پر جو مناظر دکھلائے جارہے ہیں، سنیما گھروں اور کلبوں کے ذریعہ جس تہذیب اور کلچر کو عام کیا جارہا ہے، ان سب کا نتیجہ یہی ہے، آزادی کے نام پر عورتوں کو بے حیا بنایا جارہا ہے، ان کے کپڑے اتارے جارہے ہیں، ان کو اپنی ہوس کا شکار بنایا جارہا ہے، پہلے تو کوشش کی جاتی ہے کہ عورت پیدا ہی نہ ہو، اور اگر پیدا ہو جائے تو اس کو برہنہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جن اداروں سے انسان بنتے اور ڈھلتے ہیں، جہاں اخلاق وشرافت اور عفت وعصمت اور نیکی وتقوی کی تعلیم دی جاتی ہے، انسانیت کا درس دیا جاتا ہے، انسانوں کو انسان بننا سکھایا جاتا ہے، انہیں الزام لگا کر ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، الزام اس لئے لگایا جاتا ہے تاکہ انہیں ختم کرنا آسان

---

(۱) جامعہ ام سلمی للبنات، جھارکھنڈ میں کی گئی تقریر۔

ہو، کیونکہ اس کے بغیر دشمن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

مدارس پر الزام ہے کہ یہ دہشت گردی کے اڈے ہیں، اور خوف وہراس پھیلاتے ہیں، لیکن اگر غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دہشت گرد ہماری عصری تعلیم گاہوں سے نکل رہے ہیں وہاں روزانہ ہنگامے ہوتے ہیں، لاٹھیاں چلتی ہیں، گولیاں چلتی ہیں، بم پھٹتے ہیں، اور ہمارے یہاں؟ ہمارے یہاں یہ سب کچھ نہیں ہوتا، ہم تو ڈنکے کی چوٹ پر یہ بات کہتے ہیں کہ ہمارے مدارس کو رات اور دن میں کسی وقت بھی آکر دیکھ سکتے ہیں، ان میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ملے گی۔

اس وقت دنیا میں سب کے سر پر طاقت اور دولت کا بھوت سوار ہے، ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ اصل کامیابی طاقت ودولت کے حصول میں ہے، یہ دو چیزیں اگر حاصل ہوجائیں تو انسان کامیاب ہے، اور پھر انہیں حاصل کر کے بجائے انسانوں کی بھلائی کے ان کی تباہی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں ہمارے یہ مدارس جو انسانی قدروں کے تحفظ کا کام کرتے ہیں، بڑے غنیمت ہیں، اور لائق قدر ہیں، اور تحفظ وہی کرسکتے ہیں جن کی نظر میں انسانی قدروں کی اہمیت ہے، ہم ایسے مراکز اور ادارے قائم کریں جن میں دین واخلاق اور انسانیت کا درس دیا جائے، اور انسانی قدروں کا تحفظ ہو، آپ کے اندر دین اور دینی باتوں کے سننے کا جو شوق ہے وہ اس لئے ہے کہ آپ کے بزرگوں نے آپ کی ویسی تربیت کی، اور اس بات کی فکر کی، اب یہ کام آپ کو کرنا ہے تاکہ آئندہ نسل مسلمان باقی رہے، دنیا میں ان کو بے دین بنانے کی جتنی سازشیں اور کوششیں ہو رہی ہیں، اگر ان کا توڑ نہیں کیا گیا تو ان کا مسلمان باقی رہنا مشکل ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

﴿یا أیها الذین آمنوا قوا أنفسكم وأهلیكم ناراً وقودها الناس والحجارة﴾۔ (التحریم:۶)

''کہ اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (اور سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں۔''

آج کالجوں، یونیورسٹیوں اور عصری تعلیم گاہوں میں جو تعلیم ہو رہی ہے اور میڈیا جو کام کر رہا ہے، وہ اللہ سے بغاوت کی تعلیم ہے، اور اس بات کی تعلیم ہے کہ انسان انسانیت اور انسانی قدروں سے عاری ہو جائے، یہ ایک سیلاب ہے جو تیزی سے ہماری طرف بڑھتا چلا آرہا ہے، سیلاب پر اگر بند نہ باندھا جائے تو سب کو غرق کر دیتا ہے، اس لئے جب کسی گاؤں میں سیلاب آتا ہے تو اس کو روکنے کی پورے گاؤں والے مل کر کوشش کرتے ہیں، اسی طرح ہمیں اس سیلاب کو روکنے کی ضرورت ہے، اس سیلاب کو لانے کی بڑی کوششیں ہو رہی ہیں، اور بڑی طاقتیں کام کر رہی ہیں، یہ سیلاب دین دنیا دونوں کو بہا لے جائے گا، ہمیں اس کی فکر کرنی ہے کہ نئی نسل کیسی ہوگی، ہمارے راستہ پر ہوگی یا انسانی قدروں سے خالی ہوگی؟ درحقیقت یہ مدرسے ہی اس سیلاب کو روک سکتے اور اس پر بند باندھ سکتے ہیں، اس لئے یہ ہمدردی اور تعاون کے مستحق ہیں۔

مدارس پر ایک بڑا الزام یہ ہے کہ یہ ملا پیدا کرتے ہیں جو صرف اذان دے سکتے ہیں اور امامت کر سکتے ہیں، دنیا اور دنیاوی معاملات کی انہیں نہ سمجھ بوجھ ہوتی ہے اور نہ کوئی بصیرت، یہ اپنا اور اپنے بچوں کا ٹھیک سے پیٹ بھی نہیں پال سکتے ہیں، یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے، اور حقیقت ناشناسی کی دلیل ہے، ہمیں اگر چہ ان جیسے سر پھرے دیوانوں اور ملاؤں ہی کی ضرورت ہے تا کہ دین اور دین کا کام کرنے والے باقی رہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ سماجی علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں، انگریزی، معاشیات، اقتصادیات اور سیاسیات سارے علوم پڑھائے جاتے ہیں، مختلف زبانیں پڑھائی جاتی ہیں، کیا کمی ہے ان

میں؟ مدارس دینی قدروں کے تحفظ کے لئے ہیں، اس وقت قادیانی اور عیسائی مسلمانوں کو مرتد بنارہے ہیں، یہ مدارس ان کی روک تھام کرر ہے ہیں، مدارس آپ کو زیادہ تعداد میں دکھائی دیتے ہیں، لیکن پھر بھی ضرورت کے اعتبار سے ان کی تعداد بہت کم ہے، ہمارے اس ملک میں ہزاروں مسلمان مرتد ہو گئے، ہم نے ان علاقوں میں خود جا کر دیکھا ہے، اس کے باوجود لوگ اعتراض کرر ہے ہیں، آپ انہیں مدارس سے نکال کر وہاں لیجانا چاہتے ہیں جہاں انہیں انسان نہیں بلکہ مشین بنایا جاتا ہے، اخلاق و کردار سے عاری کیا جاتا ہے؟ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔

ان مدارس کی حیثیت پاور ہاؤس کی ہے، جہاں سے دین کی روشنی ملتی ہے، اگر یہ نہ ہوں تو اللہ اور اس کے رسول کو کوئی کیسے جانے گا؟ دین کا تحفظ ان مدارس کے بغیر ناممکن ہے، دوسرے ملکوں میں جہاں بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے جن کی کتابوں سے ہم آج بھی استفادہ کرتے ہیں، لیکن مدارس نہ ہونے سے وہاں اب دین جاننے والا کوئی نہیں ہے، نام ان کا مسلمانوں جیسا ہے لیکن نہ انہیں کلمہ یاد ہے اور نہ روزہ اور نماز، بس اتنا جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے اس لئے ہم بھی مسلمان ہیں لیکن مسلمان کی شناخت کیا ہے؟ اور مسلمان کہتے کسے ہیں؟ اس سے وہ بالکل بے خبر ہیں، ایسا کیوں ہوا؟ ایسا مدارس کا وجود ختم ہو جانے سے ہوا، مدارس کو نشانہ بنانا اور انہیں ختم کرنا یہ بہت بڑی سازش ہے، اور اس کے دوررس نتائج ہیں، کیونکہ ہمارے دشمن جانتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں کا تعلق دین سے باقی ہے اس وقت تک انسانوں کو اخلاق و کردار سے عاری اور ننگا کرنے کا جو کام کیا جارہا ہے وہ پورا نہیں ہوسکتا، اور ہم اپنی تخریبی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے، ان مدارس کا کام لوگوں کو ہدایت اور روشنی دینا ہے، اچھے اور برے کا فرق بتانا ہے، کیونکہ آج کل لوگ جھوٹ کو برا نہیں سمجھتے، چوری کو برا نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک چور وہ ہے جو پکڑا جائے، لہذا

اچھے برے کی تمیز ختم کردی جائے، یہ ایک تحریک اور سازش ہے، اور یہ مدارس اس کے لئے سد سکندری کا کام کررہے ہیں، مدارس کا نظام انسان کو انسان باقی رکھنے کے لئے اور دین سے ان کا تعلق جوڑنے کے لئے ہے، اس لئے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم ضروری ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے دستور چلا آرہا ہے کہ موجودہ نسل آئندہ نسل کی تربیت کرتی ہے، مختلف مسلمان ملکوں میں یہ سلسلہ ختم ہوگیا، اب وہاں کی جدید نسل اسلام کو نہیں جانتی، یہی ہمارے ملک میں ہونے کا خطرہ ہے، اسی لئے آئے دن مدارس میں دنیاوی علوم داخل کئے جانے کی وکالت کی جاتی ہے، تاکہ اگر کسی طرح ان مدارس کو ختم نہ کرسکیں تو ان کی خصوصیات کو ختم کردیں، دنیاوی علوم زیادہ سے زیادہ لاکر دینی علوم کو نکال دیں، اس لئے ہمیں ان مدارس کی قدر کرنی چاہیئے، اور ان کا تعاون کرنا چاہیئے، لیکن یہ کام لگنے سے اور کرنے سے ہوگا، صرف تمنا کرنے اور خواہش سے نہیں ہوگا۔

❖ ❖ ❖

مسلم پرسنل لا
اور
اصلاح معاشرہ

دین وشریعت کی حفاظت کرنا مسلمانوں کا اولین فریضہ (۱)

ہندوستانی مسلمانوں کے دین وشریعت کی بقاوحفاظت کی ذمہ داری انجام دینے والا مسلمانوں کا یہ متحدہ پلیٹ فارم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ'' آج سے تقریباً ۳۰ سال قبل ایک اہم ملی ضرورت کے احساس کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا، یہ وہ وقت تھا جب ملک کے حصول آزادی پر ربع صدی گذری تھی جس میں ملک کی آبادی کو اپنے مذہبی اور ثقافتی اقدار و کردار کے مطابق آزادی کی زندگی گذارنے کی نہ صرف یہ کہ پوری ضمانت حاصل ہونا چاہئے تھی، بلکہ غیر ملکی سامراج سے گلوخلاصی حاصل ہوجانے کے نتیجہ میں مزید بہتری اور سہولت بھی حاصل ہونی چاہئے تھی، لیکن اکثریتی فرقہ کے وہ افراد جو مذہبی احساس برتری اور قومی تعلّی میں مبتلا تھے وہ عائلی قوانین اور ثقافتی رسوم ورواج میں اپنے فرقہ کی بالا دستی دوسرے فرقوں پر عائد کرنا چاہتے تھے، ان کی زبانوں پر اپنے کوڈ کے تحت یکساں سول کوڈ کا نعرہ اور مطالبہ بھی آنے لگا تھا، یہ اگرچہ اقلیتوں کو دستور ہند کی طرف سے دیئے گئے حقوق کے منافی

(۱) یہ وہ خطبہ افتتاحیہ ہے جو آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے سولھویں اجلاس کے موقع پر حیدرآباد میں مورخہ ۲۱/۲۲/۲۳/ جون ۲۰۰۲ء کو پڑھا گیا۔

مطالبہ تھا، لیکن اکثریتی فرقہ کے بعض اہم افراد کی طرف سے اس کو تائید ملنے پر اس کے خطرات مسلمانوں کو فکر مند بنانے لگے، اور اس کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی، اسی ضرورت کے احساس کے نتیجہ میں اہل فکر علماء اسلام اور مسلمانوں کے اہل دین ودانش بمبئی میں ۲۷-۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء میں کل ہند پیمانہ پر جمع ہوئے، اور حالات پر نظر رکھنے اور دین وشریعت کی حفاظت کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنے کے لئے ان کے اجتماع میں طے کیا گیا کہ ملک کے چوٹی کے علماء اور زعماء دین وملت کی سرکردگی میں دین وشریعت کے دفاع وحفاظت کے لئے ایک متحدہ بورڈ کی تشکیل کی جائے، چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے اس کی تشکیل کی گئی، اور ملک کے جلیل القدر تعلیمی ادارہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا، وہ دار العلوم دیوبند جیسے بالشان تعلیمی ادارہ کے مہتمم اور اپنے عہد کے سرگروہ علماء میں تھے، اور دین وشریعت کے معاملہ میں ان کا بڑا وزن تسلیم کیا جاتا تھا، ان ہی کے ساتھ ملک کے مقتدر شرعی ادارہ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے امیر جناب مولانا منت اللہ رحمانیؒ سکریٹری جنرل قرار پائے، ان کا بھی اچھا علمی وقار اور علماء دین کے درمیان ان کا بھی وزن تھا، بورڈ کو ہندوستانی مسلمانوں کے تمام طبقوں اور مسلکوں کا تعاون وحمایت حاصل ہوئی، یہ مسلمانوں کے لئے بڑی فال نیک تھی کہ ان کے مشترک مذہبی مقصد کے لئے ان کا متحدہ پلیٹ فارم بن جائے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے خاص انعام تھا، یہ انعام الحمد للہ تا حال جاری ہے۔

مسلمانان ہند کے پرسنل لا کی حفاظت ودفاع کے اس مشترک اور متحدہ پلیٹ فارم نے اپنے قیام کے وقت سے ہی دستوری اور جمہوری طریقوں سے اپنا کام شروع کیا، ان کے اس سنجیدہ اور علمی مزاج کے حامل پلیٹ فارم کے لئے اس سیکولر

ملک ہندوستان میں اختیار کرنے کا یہی زیادہ موزوں اور نتیجہ خیز طریقہ تھا، کیونکہ یہاں کے مسلمان ملک کی ایسی اقلیت ہیں جو اپنے سے کئی گنا تعداد کی اکثریت کے درمیان رہتے ہیں، ایسی صورت میں افہام وتفہیم اور دستوری حقوق کے حوالہ سے کوشش زیادہ کارآمد طریقہ تھا، چنانچہ بورڈ نے اولاً تمام مسلمانان ہند کو اس مشترک مقصد کے لئے متحد رکھنے اوران میں اس مقصد کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا کرنے پر توجہ دی، پھر حکومت کے پالیسی ساز ذمہ داروں کو اپنے مقصد کے برسرحق ہونے، نیز امت اسلامیہ کے لئے اس سے دست برداری کے ناقابل عمل ہونے کو باور کرانے کی سنجیدہ اور ٹھوس کوششیں کیں۔

بورڈ کی ان دوطرفہ کوششوں کا خاطر خواہ فائدہ ہوا، اور ملک کے غیر مسلم دانشور طبقہ کے سنجیدہ افراد نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا، اور تائید بھی کی، لیکن اکثریتی مذہب کے ایک حلقہ نے اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا، اور یکساں سول کوڈ کو زیادہ اہمیت کا مسئلہ قرار دیا، اور یہ بات اس حد تک پہونچی کہ بورڈ نے اپنی کوشش کے صرف ۱۲ سال گذارے تھے کہ اپریل ۱۹۸۵ء میں ایک مسلمان جوڑے شاہ بانو اوران کے شوہر محمد احمد خاں کے درمیان طلاق کا مسئلہ پیش آیا جس نے جھگڑے کی شکل اختیار کی، اور مسئلہ سپریم کورٹ تک پہونچا جہاں اس کے چیف جسٹس چندر چوڑ صاحب کا ذہن یکساں سول کوڈ کا تھا، چنانچہ انہوں نے ایک قانونی نکتہ کو بنیاد بنا کر اس مقدمہ میں طلاق کے اسلامی حکم کے برخلاف فیصلہ دیا۔

اس فیصلہ نے مسلمانوں کے لئے اس خطرہ کو حقیقت بنادیا، جس سے شریعت اسلامیہ کو محفوظ رکھنے کی کوششیں کی جارہی تھیں اور چونکہ فیصلہ عدالت علیا کا تھا اس لئے دیگر کسی عدالت میں اس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا، اب گنجائش صرف یہ رہ جاتی تھی کہ ملک کے قانون ساز ادارہ پارلیمنٹ کی طرف رجوع کیا جائے جس کے لئے

ارکان پارلیمنٹ کے دو تہائی ارکان پر اثر رکھنے والی پارٹی اور خاص طور پر اس کے سربراہ کو مطمئن کرنے کی ضرورت تھی، چنانچہ بورڈ نے اس کے لئے بہت سمجھداری حکمت اور افہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کیا، بورڈ کے صدر مولانا قاری محمد طیبؒ اس واقعہ سے دو سال قبل ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو انتقال کر چکے تھے، ان کی وفات کے بعد بورڈ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں تھا، علمی وملکی دونوں سطح پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقام تھا جس کو حکومت کے حلقہ میں بھی محسوس کیا جاتا تھا، چنانچہ وہ اور اس کے لائق جنرل سکریٹری مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے دانشمندی اور افہام وتفہیم کی اپنی علمی قابلیت سے اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کو اسلامی قانون طلاق کو لائق اعتماد ماننے پر راضی کرلیا، اور اس کی بنیاد پر وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں ایک ترمیمی بل لاکر اسلامی قانون طلاق کو دستوری حیثیت دیدی، اس طرح اس خطرہ کو جو سپریم کورٹ کے جج کے فیصلہ سے اسلامی قانون کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار کے مانند تھا، بے اثر کردیا۔

بورڈ کا یہ ایسا کارنامہ تھا جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس وقت کے حالات وامکانات کو سامنے رکھتے ہوئے ہی کیا جاسکتا ہے کہ باوجود اس کے کہ اس وقت اگرچہ ملک کی اکثریت اور پارلیمنٹ کے بیشتر ارکان اس طرح کے ترمیمی بل لانے کے حامی نہ تھے پھر بھی وزیر اعظم جو غیر مسلم تھے اس حد تک مسلمانوں کے کاز کے حامی بن جائیں کہ سب کی مخالفت کے باوجود ترمیم منظور کرالیں، یہ ایک نہایت غیر معمولی واقعہ تھا، بورڈ نے اپنے اس کارنامہ کے ذریعہ ملک میں بڑی اہمیت حاصل کرلی، اور اس کے وقار میں بیحد اضافہ ہوا، اور سب نے یہ محسوس کیا کہ اس مشکل ترین کارنامہ میں بورڈ کے ذمہ دار ارکان کی کوششوں اور خاص طور پر صدر بورڈ اور جنرل سکریٹری کے سر سہرا رہا۔

بورڈ نے اپنی اس اہمیت وشہرت کے ساتھ شریعت اسلامی کی حفاظت ودفاع کا کام جاری رکھا، اس درمیان میں یکے بعد دیگرے اس کی دونوں اہم شخصیتیں اس دنیا سے رخصت ہوئیں، اور بورڈ نئے قائدین ۱۹۹۱ء میں مولانا منت اللہ رحمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر مولانا سید نظام الدین صاحب، بطور جنرل سکریٹری، اور ۱۹۹۹ء میں اس کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات پر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ، بطور صدر کی رہبری میں آ گیا، یہ دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ پر اپنے نئے منصبوں پر آنے سے قبل ہی سے بورڈ کے مزاج سے پوری طرح واقف اور اس کی سابقہ کارکردگیوں میں برابر شریک رہے تھے، چنانچہ وہ اس بات کے مستحق تھے کہ بورڈ کے اعلیٰ منصبوں میں خلاء پیدا ہونے پر ان سے خلاء کو پُر کیا جائے۔

بورڈ کی ذمہ داریوں کو یہ دونوں حضرات بطریق احسن انجام دینے کا فریضہ انجام دیتے رہے، دونوں حضرات بورڈ کے اولین روح رواں اور جنرل سکریٹری مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ امیر شریعت بہار واڑیسہ کے خاص تربیت یافتہ اور معاون بھی رہے تھے، ان میں سے مولانا نظام الدین صاحب امارت شرعیہ کی نظامت کے ذمہ دار تھے اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ امارت شرعیہ کے قاضی القضاۃ تھے، ان کو قوانین شریعت پر عبور بھی حاصل تھا، اور وہ استدلال وتفہیم کی اچھی صلاحیت کے مالک بھی تھے، افسوس ہے کہ ان کو بورڈ کی صدارت کی ذمہ داری کی انجام دہی کی مدت صرف دو سال کی ہی مل سکی، اور وہ ایک طویل علالت کے نتیجہ میں اس دنیا سے رخصت ہو کر بورڈ کی قیادت میں ایک خلاء چھوڑ گئے۔

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال ملک کے ان حالات میں ہوا جن میں ملت کو اہم مسائل درپیش تھے جن میں ان کی بڑی ضرورت

تھی، انھوں نے صدر ہونے کے بعد بورڈ کے کام کو ترقی دینے کی کوشش کی، قوانین شرعیہ پر بورڈ کی طرف سے جو کام انجام دیا جارہا تھا، وہ ان کی توجہ سے تکمیل تک پہونچا، نیز اسلامی قانون شریعت کے خلاف بعض عدالتوں میں جو بعض فیصلے وقتاً فوقتاً ہوئے ان کو عدالت میں چیلنج کرنے کا کام بھی اچھا انجام پاتا رہا، مسلمانوں کے شرعی مسائل میں آپسی جھگڑوں کو مسلمانوں کے اپنے ملی دائرے ہی میں حل کرنے کے لئے دارالقضاء قائم کرنے اور چلانے کا کام بھی ہوا۔

مسلمانوں کا اسلامی تشخص اور ان کی اسلامی شریعت پر عمل یہ ان کی ایسی ضرورت ہے کہ اگر اس میں رکاوٹ پڑتی ہے تو مسلمانوں کا بحیثیت مسلمان وجود باقی نہ رہ سکے گا، اور مسلمانوں کے لئے مسلمانوں کا عنوان ایک لفظ غلط بنکر رہ جائے گا، اس لئے جس طرح ہم اپنی اقتصادی ضرورتوں اور اپنے مادی تقاضوں کی فکر کرتے ہیں ہم کو اپنی شریعت کی حفاظت اور اس پر عمل کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی فکر کا فریضہ بھی انجام دینا ضروری ہے، ہم کو اس کے لئے بورڈ کی طرف سے جو جدوجہد ہورہی ہے اس کے ساتھ پورا تعاون کرنا ہوگا۔

ہندوستان میں مسلم پرسنل لا پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا کئے جانے یا اس کو ملک کی اکثریت کے پرسنل لا میں تبدیل کئے جانے کے خطرہ کو دور کرنے کے لئے بورڈ کی طرف سے جو کوششیں ہوئیں اور بورڈ نے اس مقصد کو کامیاب طریقہ سے انجام دیا، یہ بڑا قابل قدر کام انجام پایا، کیونکہ اس کائنات کے مالک نے انسانوں کے لئے جو ضابطۂ زندگی اپنی کتاب کے ذریعہ اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مقرر فرمایا ہے، اس کے مقرر فرمانے کے ساتھ یہ بھی حکم دیا ہے کہ اس ضابطہ پر عمل کرنا بھی لازمی ہے، اور مسلمان کے لئے اس کے خلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، فرمایا:

﴿ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الكافرون﴾ (المائدة:۴۴)

''اور جنہوں نے اس کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا وہ کفر کرنے والے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الظالمون﴾ (المائدة:۴۵)

''اور جنہوں نے اس کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا وہ بڑے غلط کار و خطا کار ہیں۔''

مزید فرمایا:

﴿ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الفاسقون﴾ (المائدة:۴۷)

''اور جنہوں نے اس کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا وہ برا اور ذلیل کام کرنے والے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما﴾ (النساء:۶۵)

''اور یہ بات ضروری و قطعی ہے کہ لوگ صاحب ایمان نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ ان معاملات میں جن میں ان کے آپس میں جھگڑا ہو آپ ﷺ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں، پھر آپ ﷺ جو فیصلہ دیدیں اس فیصلہ کے سلسلہ میں اپنے دلوں میں کوئی تردد بھی محسوس نہ کریں اور اس فیصلہ کو بالکل مان لیں۔''

نیز فرمایا:

﴿وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا﴾

(الحشر:۷)

''اور جو کچھ تم کو رسول دیدیں (یعنی رائے یا حکم دیں) اس کو لے لو (یعنی قبول کرو) اور جس بات سے تم کو منع کردیں اس سے باز آجاؤ)۔''

لہٰذا مسلمان کے لئے اس کی گنجائش ہی نہیں کہ وہ اپنے خالق اور رب کے دیئے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسرے قانون کو قبول کرے، اس کو بہر حال اس بات کو یقینی سمجھنا اور بنانا ہے کہ خدائی قانون پر اس کے عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، اور الحمد للہ اس کام کو قانونی دائرہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بخوبی انجام دیا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی بہر حال ضروری ہے کہ مسلمان کا اس پر واقعی عمل بھی ہو، اس کی بھی پوری فکر کی ضرورت ہے، خاص طور پر اس لئے بھی کہ اس ملک کا مسلمان جس ماحول میں رہتا ہے وہ مختلف مذاہب کا ماحول ہے، اور اس میں اکثریت غیر اسلامی ہے جو قرآن کے بتائے ہوئے قانون کو نہیں تسلیم کرتی، اور اس کے اپنے خود ساختہ قوانین ورسم ورواج ہیں، ان مذہبوں کے رسم ورواج سے متاثر ہو کر کچھ مسلمان شریعت اسلامی کے خلاف عمل کے مرتکب ہوتے ہیں، اس لئے پرسنل لا کی حفاظت کا یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ مسلمانوں کو اس پر واقعتاً عمل کرنے کی پابندی کی تاکید کی جائے، اور اس کے لئے ضروری وسائل اختیار کئے جائیں، چنانچہ بورڈ نے اس سلسلہ میں اصلاح معاشرہ کے کام کو اپنا موضوع بنایا اور اسی کے ساتھ اس سلسلہ میں لاعلمی دور کرنے اور شریعت کا حکم بتانے کے لئے مختلف علاقوں میں دار القضاء قائم کئے، تاکہ عائلی معاملات میں مسلمانوں کے آپسی اختلافات عام حالات میں ان دار القضاؤں کے ذریعہ حل کئے جائیں، اور ان کے جھگڑے خود ان کے اپنے شرعی ذرائع

سے فیصل ہو جائیں۔

یہ دونوں کام آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے فرائض کا اہم جزء بنے، اور ان کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا، اور ان کے لئے کوشش کی گئی جو برابر جاری ہے، اس کوشش کو مزید وسیع اور قوی بنانے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ مسئلہ بھی حکومت وعدالت سے مسلم پرسنل لا کی حفاظت کی ضمانت حاصل کرنے کی کوشش سے کم ضروری نہیں ہے تاکہ ہماری بے عملی و بدعملی غیروں کی نظروں میں ہماری شریعت اسلامی کے ضروری ہونے کے خلاف دلیل نہ بنے، چنانچہ اس سلسلہ میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اولاً مسلمانوں کو یہ باور کرائیں کہ ان کے اسلام وایمان کی تکمیل بغیر اس کے نہیں ہوتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کی پابندی کریں، اپنے مسائل میں وہ یہ ضرور معلوم کریں کہ شریعت کا کیا حکم ہے، اور پھر اس پر عمل کریں، خواہ اس میں ان کا مادی نقصان ہی ہو، کیونکہ مادی نقصان کی حد اسی دنیاوی زندگی میں ہے، لیکن دینی نقصان کی حد تو آخرت میں دور تک گئی ہے، اور قرآن مجید میں صاف وصریح طریقہ سے واضح کیا گیا ہے کہ بغیر اس کے اسلام وایمان مکمل نہیں ہوتا، چنانچہ مسلمانوں کو شریعت پر عمل کرنے میں کوتاہی کے انجام بد کی طرف صاف طریقہ سے متوجہ کرنا چاہئے، اور ان کو ان رسموں اور رواجوں سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرنا چاہئے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکموں سے روگردانی میں مبتلا کرتی ہیں، اس سلسلہ میں ہم میں سے ہر شخص کو اولاً اپنے ذاتی اور خاندانی دائرہ میں اپنے رویہ کا جائزہ لینا چاہئے کہ اس کے یہاں اس پر کتنا عمل ہے؟ اور اپنے عائلی دائرہ میں شریعت اسلامی کی ہدایت پر عمل کرنے کا اپنے کو اور اپنے متعلقین کو پابند بنانا چاہئے، تاکہ ہم دوسروں کو جب متوجہ کریں یا غیروں کے سامنے اپنی شریعت کی اہمیت رکھیں تو ہماری بات کا وزن ہو، افسوس کی بات ہے کہ خدا کے قانون پر خود عمل کرنے میں کوتاہی مسلمانوں کی زندگی

میں اس زمانہ میں خاصی راہ پاتی جارہی ہے، اور یہ بہت خراب علامت ہے، اس کوتاہی کا ایک دوسرا سخت نقصان یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے اور اس کی وجہ سے ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوسکتے ہیں، اور اللہ کی پکڑ میں مبتلا ہوسکتے ہیں، مسلمانوں کو اس وقت جن خطرات و مصائب سے گذرنا پڑ رہا ہے کیا عجب کہ وہ ان ہی کوتاہیوں کا نتیجہ ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم ويعفو عن كثير﴾ (الشوریٰ:۳۰)

''اور جو مصیبت تم کو پہونچی ہے وہ خود تمہارے ہاتھوں کا کرتوت ہے، اور بہت سی باتوں میں اللہ تعالیٰ معاف بھی کردیتا ہے۔''

''خود تمہارے ہاتھوں کا کرتوت'' کا مطلب ہماری زندگی کے وہ اعمال بھی ہیں جو خدا کی ناراضی لانے والے ہیں، اور وہ مصیبتوں کو لاتے ہیں۔

ہماری یہ کوشش بھی بھرپور ہونا چاہئے کہ ہم اپنے معاشرہ کو خدا کے بھیجے ہوئے احکام کی خلاف ورزی سے زیادہ سے زیادہ محفوظ بنائیں، اور اس کے لئے اصلاح معاشرہ کے کام کو بہت اہمیت دینا چاہئے۔

ہمارا مسلم پرسنل لا کا یہ بورڈ اگر مسلم پرسنل لا کے ان دونوں پہلوؤں یعنی مسلم پرسنل لا کو تبدیلی سے بچانے کی فکر وانتظام اور اس پر مسلم سوسائٹی کو عمل کرنے کا پابند بنانے کی فکر واہتمام پر پوری توجہ دے تو وہ اپنی اصل ذمہ داری کو پورا کرے گا، اور یہی اس کا اصل موضوع ہے، اور اس نے اپنی تیس سالہ تاریخ میں اپنی جد وجہد کا اسی کو مرکزی موضوع بنایا ہے، اور اس کام کو گروہی عصبیت اور جماعتی سیاست سے اپنے کو بلند رکھتے ہوئے انجام دیا ہے، اسی وجہ سے یہ مسلمانوں کا متفقہ پلیٹ فارم بنا ہے، ہم کو اس کا بھی پورا اہتمام رکھنا ہے کہ اس کا یہ امتیاز قائم رہے، اس کے لئے بورڈ

کے ذمہ داروں کو یہ لحاظ رکھنا ہے کہ ان کی جماعتی وابستگیاں بورڈ پر اثر انداز نہ ہوں، نیز ایسے مسائل میں الجھنے سے بھی بچنا ہے جو بورڈ کے اپنے طے کردہ دائرہ عمل کے اندر ٹھیک سے نہیں سماتے، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل یوں تو بہت ہیں اور متنوع قسم کے ہیں، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ بورڈ کے لئے ان سب مسائل کی خصوصی فکر کرنے کی ذمہ داری دشوار اور اس کے اصل کام میں حارج ہے، اس سے اس کے اصل موضوع کی فکر میں کمی واقع ہوسکتی ہے، ان دیگر موضوعات کے معاملات کی فکر کرنے کے لئے مسلمانوں کی دیگر متعدد جماعتیں موجود ہیں، وہ ان کا حق ادا کرنے کے کام کو زیادہ فکر و دلچسپی سے کرسکتی ہیں، اس طرح بورڈ کی طرف سے اپنے اصل کام کے علاوہ دیگر مختلف انداز کے کاموں کی طرف کسی خاص توجہ دہی کی ضرورت نہیں رہتی، بورڈ کی اپنی الگ خصوصیت اور مسلمانوں کے متفقہ مسئلہ میں مسلمانوں کی متفقہ نمائندگی کی صفت برقرار رہتی ہے۔

❖ ❖ ❖

اسلامی شریعت انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کی رعایت والا ایک جامع قانون ہے[1]

ہمارے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے آغاز کو تقریباً ۳۳ سال ہو رہے ہیں جس کو ایک تہائی صدی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، یہ ایسی مدت ہے جس میں ایک انسان کی کارگزاری کا زمانہ عموماً ختم ہوکر دوسری نسل کی کارگزاری کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے، اس مدت میں جو کارگزاری ہوئی اس کا جائزہ لینے کا یہ ایک موقع ہوتا ہے تاکہ موجودہ ذمہ دار حضرات اپنے پیش رؤوں کی فکرمندی اور ادائیگی عمل سے سبق لیں، اور اس سے آئندہ کے کام کے سلسلہ میں زادِ راہ حاصل کریں۔

ہم اس نقطۂ نظر سے جب جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ ہمارے بڑوں نے جنھوں نے کام کی یہ عظیم ذمہ داری سنبھالی تھی نہایت ہی ذمہ دارانہ اور نتیجہ خیز طریقہ سے مفوضہ کام انجام دیا، آج سے تین دہائی پہلے جب اس بورڈ کی تشکیل ہوئی تو شریعت اسلامی کو اپنے مقام سے ہٹانے اور اس میں محض اپنی انسانی سمجھ سے ردو بدل کرنے کی آوازیں اٹھنا شروع ہوئی تھیں، یہ وہ وقت تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت کو اپنی زندگی کے تحفظ کے سلسلہ میں جو خطرات تقسیم ملک کے واقعہ

---

(۱) خطبۂ صدارت اجتماع عام آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ منعقدہ: ۱۹؍۲۱ اکتوبر ۲۰۰۲ء، پٹنہ، عظیم آباد۔

کے نتیجہ میں پیش آرہے تھے، ان سے کسی حد تک محفوظ رہنے کی فضا بنی تھی، ابھی اس کی طرف سے مسلمان پورے مطمئن نہیں ہوئے تھے کہ اسلامی شریعت کو پسند نہ کرنے والوں کی طرف سے اس کو بدلنے کی خواہش ظاہر کی جانے لگی، ہمارے باغیرت اور اہل شعور علماء اور عوام نے اس خطرہ کو عظیم خطرہ سمجھا، کیونکہ مسلمانوں کا اصل تشخص ان کی شریعت کے صحیح تشخص ہی سے وابستہ ہے، اور اگر یہ تشخص باقی نہ رہے تو امت کی وہ انفرادیت یا خصوصیت جس پر امت کا تعین اور تشخص ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتی ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں کہ خود امت کا تحفظ بھی باقی نہ رہا کیوں کہ اگر امت کا تشخص دوسری امتوں کے تشخص میں گم ہو گیا تو پھر یہ امت ہی کب باقی رہی، اسلامی شریعت ایک جامع قانون زندگی اور انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کی رعایت رکھنے والا، اور ان میں رہنمائی کرنے والا قانون ہے، اس میں عقیدۂ توحید اور آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اتباع کو اصل بنیاد کی حیثیت حاصل ہے، اس کے ماننے پر ہی مسلمان مسلمان کہلاتا ہے، اس شریعت میں اس کے ماننے والوں کی زندگی کی فطری ضرورتوں اور تقاضوں کی پوری رعایت رکھی گئی ہے، اس کو دوسرے آسمانی مذاہب کی شریعتوں کے مقابلہ میں ایک یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں اس کے ماننے والوں کی زندگی کا ضابطۂ عمل مکمل شکل میں دیدیا گیا ہے، اس شریعت کے مکمل شریعت ہونے ہی کی بنا پر اس میں کسی تغیر اور تبدیلی کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی، دین وشریعت اسلامی کی یہ تکمیل خود انسان کے خالق ومعبود پروردگار عالم کی طرف سے کی گئی، جس کو قرآن مجید میں ﴿اَلْيومَ اَكْمَلْتُ لكم دينكم واَتْمَمْتُ عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا﴾ (سورہ المائدہ:۳) ''آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا، اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کردیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کرلیا'' کے الفاظ سے صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے، اس دین حق کے نبی آخر الزماں حضرت مصطفیٰ ﷺ

کی وفات کے بعد اس دین اور اس کی شریعت کی حفاظت کی ذمہ داری ان کی امت کے علماء اور اس دین کے جاننے والوں پر آئی، جس کو اس امت کے علماء نے ہمیشہ پورا کیا، چنانچہ جب اس ملک میں اس شریعت کے تحفظ کے لئے خطرہ محسوس کیا گیا تو اس کے لئے یہاں کے علمائے حق نے اس کو روکنے کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے اس جامع اور نمائندہ ادارہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کی، اور الحمد للہ اس ادارہ نے اپنا فریضہ بخوبی انجام دیا، اس کے لئے ہم اپنے پیش رؤوں کے اخلاص اور کارگزاری کے معترف اور شکر گزار ہیں، اب ہمیں اس بات کی طرف پوری توجہ کرنا ہے کہ شریعت اسلامی کے تحفظ کے سلسلہ میں ان کے بعد جو ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے اس کو ہم انھیں حضرات کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی ممکنہ صلاحیتوں کے ذریعہ پوری فکر مندی کے ساتھ انجام دیں، ہمارے لوگوں پر اس وقت اسلامی شریعت کے تحفظ کے سلسلہ میں دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے ایک اندرونی دوسرے بیرونی، یہ دونوں ذمہ داریاں دراصل ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں یہ ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس بات کی فکر رکھیں کہ اسلامی شریعت یعنی مسلمان کی زندگی کے لئے مذہب کی طرف سے جو تعلیمات ہیں ان پر مسلمان عمل کریں اور اس کے تحفظ کو قائم رکھنے کی راہ میں باہر سے کوئی رکاوٹ ڈالی جائے تو اس کو دور کریں، ہم پر یہ ذمہ داری ہے کہ دین وشریعت کی اس حفاظت کے سلسلہ میں ممکنہ وسائل اور تدابیر اختیار کریں، اسی کے تحت ہماری عملی زندگی کے وہ مسائل آتے ہیں، جن کو پرسنل لا کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے، اور اسی میں سول کوڈ کے وہ سب مسائل بھی آتے ہیں جن کے سلسلہ میں ہماری شریعت میں متعین ہدایات دی گئی ہیں، لہذا ان میں ہم کوئی تبدیلی اور تغیر قبول نہیں کر سکتے اور نہ ان کو کسی دیگر مذہبی تعلیمات میں ضم کر سکتے ہیں، چنانچہ یکساں سول کوڈ کی جو آواز مختلف جگہوں سے اب پھر آنے لگی ہے وہ ہمارے مذہبی تحفظ کے ساتھ کسی

طرح ہم آہنگ نہیں ہوسکتی، اسلامی شریعت کے بعض مسائل کو جو اسلام کو ناپسند کرنے والے لوگوں کی طرف سے اس وقت موضوع بحث بنایا جا رہا ہے کہ ان میں تغیر کیا جائے یا دیگر مذاہب یا مروجہ قوانین میں ضم کر دیا جائے اس سے شریعت اسلامی میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے جیسے نکاح یا طلاق کے سلسلہ کے مسائل اور متبنّیٰ بنانے کے سلسلہ کے مسائل اور وراثت کی شرعی تقسیم کے مسائل جن سے ہمارے پیش رؤوں کو سابقہ پڑا تھا جس کو انھوں نے بخوبی حل کیا، اور اس طرح انھوں نے شریعت اسلامی کے قانون کی حفاظت کی، یکساں سول کوڈ کا مسئلہ بھی آیا تھا پھر حکومت کے اعلان کے بعد وہ دب گیا تھا کہ اس کو نافذ نہیں کیا جائے گا، لیکن اب پھر اس کی آوازیں اٹھ رہی ہیں ہم کو جمہوریت اور سیکولرزم اور دستور کے اصولوں کے مطابق اس کا بھی مقابلہ کرنا ہے تاکہ ہماری شریعت کا صحیح تحفظ ہوسکے، یہ مذکورہ مسائل اسلامی شریعت کے تحفظ کے بیرونی دائرے کے مسائل ہیں جو ہماری ذمہ داری میں آتے ہیں، لیکن اندرونی دائرہ میں ہم کو اپنے معاشرہ کے اندر دیکھنا ہے کہ ہم خود اپنی شریعت کا تحفظ اور اس کا التزام کس حد تک اپنی زندگیوں میں کرتے ہیں، اس لئے یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ ہم دوسرے سے تو مطالبہ کریں کہ تم ہماری شریعت اور دین پر عمل کرنے سے ہم کو نہ روکو اور ہم خود ان کو اپنی عملی زندگیوں میں مجروح کرتے رہیں، ہمارے سامنے قرآن مجید کا یہ صریحاً حکم ہے کہ:

﴿فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما﴾

(سورۃ النساء: ۶۵)

”پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں آپ سے تصفیہ کرادیں، پھر اس آپ کے

تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا بہ پورا تسلیم کرلیں۔"

لہذا ہمارے بورڈ کے سامنے شریعت کے تحفظ کے سلسلہ میں ہماری زندگیوں کی اندرونی بدعملیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

ہمارے سامنے کچھ عرصہ سے بابری مسجد کا مسئلہ بھی زیر فکر وتوجہ کا باعث بنا ہوا ہے، اسلام میں مسجدوں کا جو شرعی تقدس ہے، بابری مسجد کے سلسلہ میں اس کو ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس مسئلہ نے مذہبی رنگ سے شروع ہوکر سیاسی مصلحتوں کا رنگ بھی اختیار کرلیا ہے، اس کی وجہ سے مسئلہ کی دشواری میں اضافہ ہوگیا ہے، اگرچہ بورڈ کا کام اصلاً مذہبی رخ کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے، لیکن اس مسئلہ کے حل میں اس پہلو سے بھی سابقہ ہے، جس کے لئے ہم کو قانونی ماہرین سے مدد لینا ہوتی ہے، دوسرا ایک اہم مسئلہ مدارس اسلامیہ کا تحفظ ہے جن کو کچھ مدت سے الزامات کا سامنا ہے، اور اس کی وجہ سے ان کے تحفظ کے لئے فکر ذمہ داری ہے۔

یہ وہ مسائل ہیں جن سے ہمارے بورڈ کو اس وقت بطور خصوصی سابقہ ہے، بورڈ نے اپنے مجلس عاملہ کے اجتماعات میں ان پر غور وفکر کیا اور تدابیر طے کیں اور ان مسائل کو خصوصی طور پر حل کرنے کے لئے کمیٹیوں کی تشکیل کی۔

ان میں بابری مسجد کمیٹی، اصلاح معاشرہ کمیٹی، دار القضاء کمیٹی، تحفظ مدارس اسلامیہ کمیٹی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، بابری مسجد کمیٹی نے بابری مسجد کے سلسلہ کے مقدمات اور اجودھیا میں مسجد کے مخالف عناصر کی طرف سے قانون شکنیوں اور قابل اعتراض طریقوں کے اختیار کئے جانے پر نظر رکھنے اور جمہوری اور دستوری طریقہ سے ان کا مقابلہ کرنے کی پوری فکر رکھی، جس کی کارکردگی کی رپورٹ ہمارے عاملہ کے جلسوں میں آتی رہی، بابری مسجد کے مسئلہ کے سلسلہ میں مخالف عناصر کی طرف سے بات چیت کے عنوان سے بعض ایسی باتوں پر بھی راضی کرنے کی کوشش کی جاتی رہی

جو ظاہراً قابل قبول حل نکالنے کی تھی، لیکن اندرونی طور پر ان سے مسجد کے سلسلہ میں مسلمانوں کے موقف کو نقصان پہنچتا، ان کوششوں کو ظاہری طور پر مناسب محسوس کیا گیا لیکن ان کی حقیقت ظاہر ہونے پر ان کو ماننے سے معذرت کردی گئی، بورڈ کا موقف یہ ہے کہ ہم جب کہ ایک سیکولر دستوری اور جمہوری ملک میں رہتے ہیں تو بات چیت اور افہام وتفہیم کے مواقع کو ہم آنکھ بند کرکے مسترد نہیں کرسکتے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے مسائل کی بنیادی حقیقتوں سے روگردانی کریں، مسجد کی جگہ مقدس ہے اور وہ وقف للہ ہے، وقف للہ ہونے کے بعد بندوں کو اختیار نہیں رہتا، اس لئے ہم مسجد کی جگہ کی نوعیت کے سلسلہ میں شریعت کے دیئے ہوئے احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں، اس اصول کے ساتھ بات چیت کرنے میں اور نزاع اور ٹکراؤ دور کرنے کے لئے قابل قبول حل تلاش کرنے میں ہم کو انکار نہیں، یہی بات یکساں سول کوڈ اور پرسنل لا کے سلسلہ میں بھی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ ہے جس کی بورڈ کی تشکیل کے وقت سے وضاحت کی جاتی رہی ہے اور اسی کے مطابق طریقہ کار اختیار کیا جاتا رہا ہے، یہ دونوں مسئلے شریعت اسلامی کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت رہتے ہوئے ہی زیر عمل لائے جاسکتے ہیں اور ان میں کوئی محض اپنی رائے اور عام سمجھ سے کوئی نئی بات نہیں کرسکتا۔

ہمارے مدارس اسلامیہ دینیہ کے متعلق غلط الزام تراشیاں کچھ دنوں سے کی جارہی ہیں وہ بھی بہت قابل اعتراض بات ہے، یہ باتیں حقیقت حال کو معلوم کئے بغیر مسلمانوں کی اسلامی تحفظ کی بنیادوں کو توڑنے اور دوسروں میں ضم کرنے کے رجحان کا پتہ دیتی ہیں، ہمارے مدارس نہ صرف یہ کہ پُرامن اور انسانیت نواز مقاصد کے حامل ہیں، بلکہ ملک کی ترقی میں اور ملک کی قومی ضرورت کے ایک اہم جزء کو پورا کرتے ہیں، اور سچی بات یہ ہے کہ اس سے ایک طرف ملک کی تعلیمی ضرورت کو پورا کرنے کی

جو ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، اس کے ایک حصے میں یہ مدارس حکومت کے بوجھ کو ہلکا کرتے ہیں اور مزید یہ کہ ملک کی اقلیت کے اقتصادی طور پر کمزور ہونے کی صورت میں یہ مدارس ان کو تعلیم کے مالی بوجھ سے ہلکا کر کے ان کی مجبوری کا حل نکالتے ہیں اس لئے کہ یہ مدارس مفت تعلیم اور مفت رہائش کی بنیاد پر تعلیم دیتے ہیں، بورڈ کی طرف سے ایک کمیٹی اس بات کو سمجھانے کے لئے اور مدارس کی انتظامیہ کو اپنے انتظامات میں زیادہ سے زیادہ باقاعدگی لانے کی طرف توجہ دلانے کے لئے قائم ہے اور وہ کام کر رہی ہے۔

تحفظ ملت کے سلسلہ کا ایک مسئلہ یہ بھی اہم ہے کہ مسلم قوم کی نئی نسل کو زیادہ سے زیادہ تعلیم کی ضرورت کا احساس دلانے اور زیادہ سے زیادہ افراد کو تعلیم یافتہ بنانے کی طرف توجہ دلانے کی طرف توجہ کی جائے، اور اس کے لئے ضروری تدابیر بھی اختیار کی جائیں۔ تعلیم یافتہ بنانے کا مطلب اپنے زمانہ کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے علم کے شعبوں کو اختیار کرنا ہے، اور ساتھ ساتھ شریعت اسلامی کی بنیادی تعلیمات سے لازماً واقف کرانا ہے۔

بورڈ کی نظر میں شریعت اسلامی کی پابندی کا مسئلہ بہت اہم ہے، مسلم معاشرہ جو غیر معمولی طریقہ سے کمزوری اور بگاڑ کا شکار ہو گیا ہے اس کو درست کرنے کی ذمہ داری سب پر عائد ہوتی ہے چنانچہ شریعت اسلامی کے ضوابط کی پابندی کرانے کی طرف توجہ بہت ضروری ہے، مسلمانوں کے درمیان جو آپسی نزاع اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں، چاہے وہ نکاح وطلاق کے معاملے ہوں یا وراثت کے ہوں ان کو حل کرنے کے لئے مسلمانوں کو ضروری رغبت دلانا اور شریعت کی پابندی کی تاکید کرنا اور ان کو اس بات کی تلقین کرنا کہ اگر وہ آپس کے افہام وتفہیم سے حل نہ ہوں تو اسلامی پنچایت جس کو دار القضاء کہتے ہیں اس کے ذریعہ حل کیا جائے، اس کے لئے باقاعدہ مہم چلانے کی خاطر

بورڈ نے اصلاح معاشرہ کمیٹی قائم کی ہے جس نے اپنی ذمہ داری انجام دینا شروع کر دی ہے، اس کمیٹی کی شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہوگئی ہیں، مرکزی کمیٹی اور مقامی کمیٹیاں اپنے اپنے امکانات کے مطابق کام کر رہی ہیں، لیکن اس میں سارے مسلمانوں کو تعاون دینے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایک مفید طریقہ یہ بھی ہے کہ شریعت کے حکم کے خلاف عمل کے ارادہ کی اطلاع عمل کئے جانے سے پہلے جیسے ہی ملے چند مؤثر افراد صاحب معاملہ سے نجی دائرہ میں رہتے ہوئے ملاقات کر کے ان کو شریعت کی پابندی کی تلقین کریں، اس سے فائدہ کی توقع زیادہ ہے، اصلاح پسند افراد اس کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے محض رضائے الٰہی کے لئے اور داعیانہ جذبہ سے اس کام کو انجام دیں، اس کا اجر ان کو آخرت میں ملے گا۔

مرد و عورت کے ازدواجی تعلقات کے سلسلہ میں مردوں سے اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ جو بعض وقت زور دستی کے واقعات پیش آتے ہیں ان کو بنیاد بنا کر اسلامی شریعت کو الزام دینے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ اسلامی شریعت اس سے بالکل بری ہے، اس نے عورتوں کے حقوق مردوں پر اور مردوں کے حقوق عورتوں پر بہت واضح طریقہ سے بتا دیئے ہیں، غلط کاری جو ہوتی ہے اس کا ذمہ دار غلطی کرنے والا ہوتا ہے، ایک اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی اجتماعی زندگی میں ایک کو بڑا بنانا پڑتا ہے، تاکہ نظم و انتظام صحیح قائم ہو سکے، اور خاص طور پر وہ شخص جو ضرورتوں کے اخراجات کا ذمہ دار ہو اس کو یہ حق زیادہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کو بڑا سمجھا جائے، اس بنیاد پر مرد و عورت میں جب رشتہ قائم ہوگا تو مرد کو اس سلسلہ میں ایک طرح کی برتری حاصل ہوگی، یہ اس لئے بھی ہے کہ اسلامی قانون کے تحت ازدواجی زندگی میں عورت کے سارے اخراجات مرد کے ذمہ ہوتے ہیں اور وہ اسی سطح کے مطابق ہوتے ہیں جس سطح سے مرد کی ضرورت کے اخراجات ہوتے ہیں نیز ازدواجی تعلق قائم ہونے کے وقت

تقریب عقد سے تعلق رکھنے والے اخراجات بھی صرف مرد کے ذمہ ہوتے ہیں، عورت اوراس کے والدین کے ذمہ کوئی صرفہ نہیں ہوتا مردکوان اخراجات کو برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ عورت کواس کی زوجیت میں آنے کی بنا پر مرد کی طرف سے ایک وقیع نذرانہ بھی دیا جانا ضروری رکھا گیا ہے جومہر کہلاتا ہے، اوروہ خالص عورت کی ملکیت ہوتا ہےاوراس کے مکمل اختیار میں ہوتا ہے، مردوعورت کے مابین تعلقات کے سلسلہ میں زمانہ ازدواجیت کے دوران کسی وجہ سے کشیدگی ہوجائے تو شریعت کی طرف سےاس کے حل کاایک مکمل طریقہ کارر کھا گیا ہےاس کواختیار کرنے کی صورت میں کسی فریق کوحق تلفی یازیادتی کی شکایت نہیں ہوسکتی۔

شریعت اسلامی میں ان سب ہی پہلوؤں کو بتایا گیا ہے،شریعت اسلامی پر ایمان رکھنے والوں کوان کوتسلیم کرنا ہوتا ہےاوراس کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے، اس کے مطابق عورت کی عزت وحرمت اواس کی ضروریات معیشت اوراس کی حفاظت اور اس کی باعزت حیثیت کالحاظ کرنا بھی مرد پرلازم قراردیا گیاہے، ان باتوں کوصحیح طور پر جاننے اوران پرعمل کرنے سے مسلمانوں کے معاشرہ میں بہتری لائی جاسکتی ہے یہ کام سب اہل شعور مسلمانوں کا ہےاوراس کوبھی اصلاح معاشرہ کمیٹی نے اپنی ذمہ داری میں لیا ہے۔

دراصل اسلامی شریعت ایسی عادلانہ اورحکیمانہ شریعت ہے کہ اس کوصحیح طور پر معلوم نہ ہونے پر ذہنوں میں جوخدشات اٹھتے ہیں اس شریعت کو سمجھنے کے بعد یہ خدشات ختم ہوجاتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے تحفظ کا مسئلہ ملت اسلامیہ ہندیہ کا بنیادی اورمشترکہ اور متفقہ مسئلہ ہے اسی لئے اس میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اوراداروں کی مشترکہ تائیدوتعاون کے ساتھ آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی تھی، اور

ان سب کی متفقہ تائید وشرکت ہی سے مسلمانوں کا یہ مشترکہ ادارہ الحمدللہ برابر کام کر رہا ہے، مسلمانوں کی دیگر جماعتوں اور اداروں کے دین وملت کی خدمت کے سلسلہ میں اپنے اپنے مختلف موضوعات اور طریقہ ہائے کار ہیں، انہی کے لحاظ سے ان کی طرف سے کام انجام دیا جاتا ہے، لیکن بورڈ ان سب کے مشترکہ اور بنیادی مقصد یعنی شریعت اسلامی کے تحفظ وتقویت کے لئے قائم کردہ پلیٹ فارم ہے، اس لئے وہ اصلاً اسی متفقہ اور بنیادی مقصد کے دائرے تک اپنے کو محدود رکھتا ہے اور اس بات کا لحاظ رکھتا ہے کہ دیگر فروعی یا اختلافی مسائل سے وہ اپنے کو بڑی حد تک الگ رکھے اور حتی الوسع ان میں دخل نہ دے، البتہ ان کے لئے کام کرنے والی جماعتوں میں سے کسی جماعت کے کام کی تائید وتعاون کا تقاضا ضروری ہو تو اس میں تعاون کرے، لیکن اس کے سلسلہ میں ایسا رویہ اختیار نہ کرے جو کسی دوسری جماعت کے خلاف پڑتا ہو، وہ ملت اسلامیہ ہندیہ کا مشترکہ اور متفقہ ادارہ ہے جو ملت کے لئے کام کرنے والوں کے ساتھ تعاون کو بھی اپنا فریضہ سمجھتا ہے، البتہ بورڈ یہ تعاون غیر جانب دارانہ طریقہ سے دیتا ہے، چنانچہ بابری مسجد کا مسئلہ جب بورڈ کے تعاون کا طالب ہوا تو بورڈ نے اس کو تعاون دینے میں کوتاہی نہیں کی، اس میں اگرچہ بڑی فکر وتوجہ اور مالی مصارف کا بوجھ بورڈ پر پڑ گیا، لیکن بورڈ نے اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے پوری تائید وتعاون کا رویہ اختیار کیا اس کے لئے اس نے ایک کمیٹی کی تشکیل کر دی تاکہ خصوصی توجہ سے کام انجام دیا جائے، اسی طرح مدارس اسلامیہ پر الزام تراشی جب ایسی سطح پر پہنچ گئی کہ مدارس اسلامیہ کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہونے لگا تو بورڈ نے اس سے بھی دلچسپی لی، اور خصوصی توجہ کرنے کے لئے اس کے لئے کمیٹی تشکیل دی، اس طرح بورڈ اپنے کو شریعت اسلامی کے تحفظ کی تقویت کے مقاصد کے ساتھ مخصوص رکھتے ہوئے ملت اسلامیہ ہندیہ کی دیگر اہمیت رکھنے والے مسائل میں تعاون کرتا ہے۔

اسلامی شریعت کے تحفظ کی ذمہ داری (۱)

بورڈ کا یہ سترہواں اجلاس ہے جو مونگیر کے اس تاریخی شہر میں منعقد ہو رہا ہے جس کو ایک صدی قبل اپنے وقت کے ایک بڑے عالم و مصلح مولانا سید محمد علی رحمانی نے اپنے وقت کے دینی فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا مرکز بنایا تھا یہ فتنے قادیانیت اور عیسائیت کے فتنے تھے جنہوں نے مسلمانوں کے اس وقت کے حالات کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سر اٹھایا تھا، مولانا محمد علی رحمانی کے اس شہر کو اپنا مرکز بلکہ اپنا وطن بنا لینے کی بنا پر ان کے نام کے ساتھ اس شہر کی نسبت مونگیری شامل ہوئی، اور وہ بعد میں مونگیری کے ہی لقب سے یاد کئے جاتے رہے، اس شہر کو بھی ان کے قیام و کام سے بڑا دینی فیض پہنچا، اور ان کے ذریعہ سے دین و ملت کی بڑی خدمت ہوئی، پھر ان کی فیض رسانی کا سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہا، جس کا بڑا سہرا ان کے نامور جانشیں اور فرزند حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے سر بندھا، ان کا بھی علمی و دینی خصوصیات کے ساتھ ملی معاملات میں خدمت کرنے کا خاصا حصہ رہا، ان کو بہار واڑیسہ کے امیر شریعت کا منصب ملا، اور ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کے وقت ان کو اس کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا جس کے تعلق سے انہوں

---

(۱) خطبہ صدارت برائے سترہواں اجلاس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، منعقدہ: مونگیر بتاریخ یکم و ۲ مارچ ۲۰۰۳ء۔

نے صدر بورڈ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، پھر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی رفاقت اور ارکان بورڈ کی معاونت میں ملت اسلامیہ ہندیہ کی اہم خدمات انجام دیں، آج ان ہی کے شہر میں یہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے اور ان کے موقر فرزند اس کے انتظام میں پیش پیش ہیں، یہ ایک ایسی مناسبت ہے جس کی رو سے مولانا مرحوم کی اور ان کے عظیم المرتبت والد کی روح انشاء اللہ مسرور وشاداں ہوگی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ بورڈ انفرادی نیز جماعتی تفرقہ واختلاف سے بچتے ہوئے کوشش کرتا رہے، بورڈ کی قوت وطاقت اسی رویہ میں مضمر ہے، اس کے لئے بورڈ پر یہ بات بھی عائد ہوتی ہے کہ بورڈ جس مقصد کے لئے وجود میں آیا وہ اپنے کو بنیادی طور پر اسی کے ساتھ مربوط رکھے اس کے علاوہ دیگر ثانوی اور ذیلی سطح کے معاملات میں اپنے کو زیادہ مشغول نہ کرے، اور اس امر کی گنجائش یوں بھی ہے کہ مسلمانوں کے ثانوی اور ذیلی معاملات کو علی العموم مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اختیار کرتی اور ان کے لئے کام کرتی ہیں وہ امت کے مختلف مسائل کو علحدہ علحدہ یا کچھ حد تک مشترک طریقہ سے بھی انجام دینے کی کوشش کرتی ہیں اس طرح بورڈ کو ان میں کم سے کم پڑنے کی سہولت حاصل ہے، لہذا وہ اپنے اصل کام اور اپنے اصل مقصد پر توجہ مرکوز رکھ سکتا ہے۔

بورڈ کا اصل کام اور بنیادی ذمہ داری جس کے لئے اس نے اپنی تشکیل کے وقت اپنی جد وجہد کا سفر شروع کیا وہ اسلامی شریعت کا تحفظ ہے، جس کا ایک وقیع حصہ عائلی قوانین ہیں، تحفظ شریعت کا یہ کام بورڈ کے زیر عمل تا حال چلا آرہا ہے درمیان درمیان میں بعض دیگر معاملات بھی اس کے زیر عمل آتے رہے، اور بورڈ نے ان میں بھی اپنا تعاون دیا، لیکن بورڈ کے سامنے بنیادی کام اور اصل ذمہ داری تحفظ شریعت کے ہی مختلف پہلو رہے ہیں۔

۱- تحفظ شریعت کے ان مختلف پہلوؤں میں ایک تو شریعت کو حکومت یا اکثریت کی دخل اندازی سے محفوظ رکھنا ہے، اس کے لئے جہاں قانون کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے تو قانون کا سہارا لینا ہے چنانچہ پہلے بھی مختلف معاملات میں عدالت سے رجوع کیا گیا اور اب بھی کیا جاتا ہے۔

۲- اور اگر ذمہ داران حکومت کے ساتھ افہام وتفہیم کی ضرورت ہو تو اس ذریعہ کو اختیار کرنا بھی بورڈ کی ذمہ داری ہے جیسا کہ شاہ بانو کیس میں کیا گیا۔

۳- تحفظ شریعت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے ہم وطن بھائیوں کے ذہنوں میں شریعت اسلامی کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کیا جائے، اس کام کو دعوتی اور علمی انداز میں اور ذرائع ابلاغ کو مہارت وقابلیت کے ساتھ استعمال کرنے سے انجام دیا جاسکتا ہے اور یہ کام ایسے ملک میں جہاں ہم غیروں کے بیچ میں رہتے ہیں اہم اور بنیادی کام ہے، اگر اس کو بھرپور طریقہ سے اور اخلاق ومحبت کے انداز سے کیا جائے تو مسلمانوں کے بہت سے وہ مسائل جو وطنی بنیاد پر الجھتے چلے گئے ہیں بڑی حد تک حل ہوسکتے ہیں۔

۴- تحفظ شریعت کا ایک اہم پہلو جو بڑا بنیادی اور اہم ہے وہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں کی زندگی میں تحفظ شریعت ہو، کیونکہ یہ بات معقول اور مناسب نہیں ہے کہ ہم حکومت سے اور عدالت سے کہیں کہ ہماری شریعت میں تبدیلی یا مداخلت نہیں ہوسکتی اور ہم خود اپنے معاشرہ میں شریعت کو محفوظ وقائم نہ رکھیں، شادیوں کے موقعوں پر لڑکی والوں پر ایسا بوجھ ڈال دینا کہ اس کو اپنی استطاعت سے زیادہ سمجھنے کی وجہ سے لڑکی والے لڑکی کو بٹھائے رکھیں بری بات ہے، اس تاخیر سے اس کی عمر ڈھل جاتی ہے، یا لڑکی والے قرض بلکہ سودی قرض سے بوجھ کو اٹھا لیتے ہیں، اور خود اپنی معیشت اس قرض کی ادائیگی میں برباد کر لیتے ہیں اس کے علاوہ خود شادی کے انعقاد پر بلند

معیار اور مسرفانہ مظاہرہ لازم سمجھا جاتا ہے، وہ بھی طرفین کے لئے یا کم از کم ان میں سے ایک کے لئے بہت زیادہ زیر بار کر دینے والا ہوتا ہے مزید یہ کہ لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی والوں سے جو جہیز مطلوب ہوتا ہے وہ اگر ان کے مطلوبہ معیار سے نہیں ملتا تو وہ لڑکی کی جان کے ہی درپے ہو جاتے ہیں، لڑکی والوں پر جہیز اور دیگر مصارف کا بوجھ ڈال دینے سے شوہر کو بیوی مفت یا بطور تحفہ کے مل جاتی ہے، لڑکی کی یہ بے قدری بعض وقت اس کے لئے بعد میں وبال جان بن جاتی ہے جب کہ اس کو شوہر ذرا سے عذر میں بآسانی چھوڑ دیتا ہے، لیکن اگر شادی میں بیوی کو لانے میں شوہر پر مناسب حال بوجھ پڑے جیسا کہ اسلام کا حکم ہے تو شوہر بیوی کو مفت کا تحفہ سمجھ کر آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا، لہذا ضرورت ہے کہ اصلاح معاشرہ کی مہم میں لوگوں کو سمجھایا جائے کہ شادی کے اصل مصارف شوہر کے ذمہ ہیں جس میں مہر کی اہمیت بنیادی ہے جہیز اور دیگر اشیاء اگر دباؤ سے لی جا رہی ہوں تو اسلامی نقطۂ نظر سے وہ مال حرام کے حکم میں ہیں۔

اس سلسلہ کی کوتاہیاں نہ صرف یہ کہ شریعت اسلامی کے خلاف ہیں بلکہ انسانی اخلاق و کردار کے بھی منافی ہیں ضرورت یہ ہے کہ اس کی اصلاح کے لئے زبردست مہم چلائی جائے، شریعت اسلامی کا تحفظ اس پہلو میں بھی کرنے کی ذمہ داری بورڈ پر عائد ہوتی ہے، اس کے لئے بورڈ کے پروگرام میں اصلاح معاشرہ کا کام ہے، اس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

۵- تحفظ شریعت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی عائلی زندگی میں جو نزاعات ابھرتے ہیں ان کے حل کے لئے ہم کو ان عدالتوں کی طرف رجوع کم سے کم کرنا چاہئے جہاں اسلامی عائلی قوانین سے واقفیت یا ان کی پسندیدگی نہیں ہے کیونکہ ان سے ہمارے لئے مطلوبہ حل حاصل کرنا مشکل ہے، اور عدالتوں میں مقدمات کی

کثرت کی وجہ سے فیصلہ آنے میں بہت تاخیر بھی ہوتی ہے اس طرح کے امور کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ دارالقضاء قائم کیے جائیں، اور مسلمانوں کو اپنے شرعی نزاعات ان میں لے جانے کو کہا جائے، چنانچہ اس پر عمل ہوا، اور وہ جہاں بھی ہوا بہت مفید ثابت ہو رہا ہے اور دارالقضاء کا قیام قانونی طور پر صحیح بھی ہے کیونکہ قانونی طور پر برادریوں کے جھگڑے ان کی پنچایتوں کے ذریعہ خاصی حد تک حل کیے جاتے ہیں، اور قانون اس کی اجازت دیتا ہے، لہذا دارالقضاء کی حیثیت مسلمانوں کے لئے ایک طرح سے بلکہ قانون کی رو سے شرعی پنچایت کی بنتی ہے، لہذا یہ مسلمانوں کے عائلی جھگڑوں اور شرعی نزاعات کے حل کے لئے مفید اور مطابق شریعت حل ہے، چنانچہ ہمارے بورڈ نے اس حل کو مناسب سمجھا ہے، ضرورت ہے کہ دارالقضاؤں کا قیام وسیع اور کثیر طریقہ سے کیا جائے تاکہ ان تک پہنچنے اور ان سے مدد لینے میں مسلمانوں کو دشواری نہ ہو۔

تحفظ شریعت کے معاملہ میں اس طرح کے پہلوؤں پر اگر خاطر خواہ توجہ صرف کی جائے گی، نیز متعلقہ مسائل کے حل میں خود سے مدد ملے گی تو ایک طرف ہم کو شریعت کے تحفظ کے لئے آواز بلند کرنے کی کوئی بڑی ضرورت پیش نہیں آئے گی، دوسری طرف ہمارا مسلم معاشرہ ایک ستھرا اور مثالی معاشرہ بن سکے گا، نیز مسلمانوں کو آپس کی ہم آہنگی اور معاشرتی عافیت وسلامتی حاصل ہوگی، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ صورت حال ہمارے ہم وطن اغیار کے لئے قابل تقلید بھی بن سکے گی، اور اس سے اسلام کے متعلق غیروں میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہوں گی، اور ان کو اسلام سے قریب کرنے کا موقع بھی ملے گا۔

بابری مسجد کا مسئلہ شروع میں صرف ایک قانونی مسئلہ تھا اس کے بارے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے صرف ذمہ دار اور مسئلہ کی اہمیت سے صحیح واقف کار

افراد ہی جانتے تھے، اس وقت قانونی کاروائی زیادہ مؤثر انداز میں ہوسکتی تھی، اور بلا فرقہ وارانہ تناؤ کے مسئلہ حل ہوجاتا یا کم از کم قابو میں لے آیا جاتا، لیکن یہ مسئلہ عوامی مسئلہ بن جانے کے بعد سیاسی اغراض رکھنے والوں کی دلچسپی کے دائرے میں داخل ہو گیا جس کی وجہ سے اس کے حل میں طوالت بھی ہو رہی ہے اور اکثریتی فرقہ میں ان کے تعصب زدہ قائدین غلط فہمیاں پیدا کر کے ان میں مسلم دشمنی کے جذبات ابھارنے کا موقع پا رہے ہیں، اس طرح دونوں فرقوں کے درمیان تناؤ بڑھا اور جذبات ابھرے جو ملکی حالات کے سکون کو برباد کرنے کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں، اس کے تدارک کی طرف خاص طور پر ملک کے ذمہ داروں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے، فرقہ وارانہ ٹینشن و ظلم جس کا اظہار ہندو متعصب تحریکات کی طرف سے خوب کیا گیا اور کیا جا رہا ہے وہ مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہے وہ تو ہے لیکن وہ خود ہندو قوم کے مزاج کو بگاڑنے والا ہے، مزاج بگڑنے پر یہ ٹینشن اور ظلم خود ان کے گروہوں اور طبقوں کے درمیان بھی استعمال ہوگا، افسوس ہے کہ ملک کے قائدین صرف الکشنی مصلحت سے اس بگاڑ کی مضرت کو نظر انداز کر رہے ہیں، ان حالات میں ہمارے قائدین کو بھی بہت سوجھ بوجھ اور دور اندیشی کے رویہ پر کاربند ہونے کی ضرورت ہے، چونکہ اس تناؤ سے نقصان ہم مسلمانوں کو زیادہ ہوسکتا ہے اس لئے فرقہ وارانہ تناؤ کو کم کرنے کی جو تدابیر ہمارے کرنے کی ہیں ان کی طرف توجہ ہمارے رہنماؤں کو خاص طور پر کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہم کو خصوصی دعاء بھی کرنا چاہئے کہ ملک کی ۲۰ کروڑ کی یہ آبادی ملک میں عزت و امن کے ساتھ اور اپنی ملی خصوصیات کے ساتھ رہ سکے، اور اپنی ذمہ داریوں کی اچھی ادائیگی کر سکے، اور شایان شان طریقہ سے اپنا مستقبل بنا سکے۔

اس ملک میں اگرچہ مسلمان اقلیت میں ہیں لیکن وہ اپنی ملی ضرورت کے وسائل اور اپنی ملی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں خود کفیل ہیں، دینی اداروں کے لحاظ سے

اور تعلیمی انتظامات کے لحاظ سے اور ملت کی ضرورت کو پورا کرنے کے لحاظ سے وہ دوسروں کے دست نگر نہیں ہیں، اس صورت حال کو جاری رکھنے کے لئے ہمارے مدرسے اور تعلیمی و مذہبی ادارے قائم رہنا بھی ضروری ہیں، ان کے خلاف جو مہم چلائی جارہی ہے وہ غلط فہمی پر یا بدنیتی پر ہے، اس کو افہام و تفہیم کے ذریعہ ہم کو تھامنا ہے، اور اس طرح ہم کو اس ملک میں اپنی خصوصیات و امتیازات کو قائم رکھنا ہے، اور اس کے لئے ضروری حکمت عملی اختیار کرتے رہنا ہے، اللہ تعالیٰ مدد فرمائے اور توفیق دے، آمین۔

بورڈ نے اپنے قیام کے وقت ہی سے اپنے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا وہ دراصل ملت اسلامیہ کے اسلامی تشخص اور شریعت اسلامی کے تحفظ کو اپنا اصل موضوع بنانا تھا، یہ وہ موضوع ہے جس سے امت کے تمام نقطہ ہائے فکر و نظر والے اتفاق رکھتے ہیں، چنانچہ بورڈ کو اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے میں امت کے سب طبقات کا تعاون حاصل رہا اس بورڈ کو پوری امت کی طرف سے نمائندگی کرنے میں بڑی مدد ملی، بورڈ کو اپنی قوت کے اس سرمایہ کو باقی رکھنے کی طرف پوری توجہ رکھنا ہے اور اپنے سلسلہ میں ملت اسلامیہ کے متفقہ اعتماد کو مجروح ہونے سے بچانا ہے۔

بورڈ نے خدمت ملت کا جو طریقہ کار اختیار کیا ہے، اور امت کے مختلف طبقات کی اس کو جو حمایت حاصل ہوئی اس بات نے اس کو پوری امت اسلامیہ ہند کا ایسا نمائندہ بنا دیا کہ مسلمانوں کی طرف سے اپنے پریشان کن معاملات میں نگاہیں مشترکہ طور پر اس کی طرف اٹھتی ہیں، بورڈ اپنی یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ ان نظروں کو حتی الوسع مطمئن کرے اور اس کی کارکردگی بہتر سے بہتر ہو، بورڈ کے سامنے بنیادی طور پر جو میدان عمل ہے وہ اسلامی تشخص اور شریعت اسلامی کے تحفظ کے متنوع کام کا ہے، یہ کام اس کو ایک طرف ملت کی اندرونی زندگی میں کرنا ہے، دوسری طرف اس کو یہ کام ملت کی بیرونی زندگی میں کرنا ہے، دوسری طرف اس کو یہ کام ملت کی بیرونی

زندگی میں انجام دینا ہے اندورن ملت کا یہ کام اصلاح معاشرہ کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کرنا ہے، اور بیرون ملت کا یہ کام اپنے ہم وطنوں کی اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں ان سے مذاکراتی اجتماعات اور ملاقاتوں کے ذریعہ اور ذمہ داران سیاست وحکومت سے افہام وتفہیم کے جمہوری طریقوں سے کرنا ہے، اسی کے ساتھ مسلمانوں کے ملی حقوق کے لئے اگر کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو اس کو دستور ہند کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں عدالت سے انصاف طلبی کے قانونی طریقے کو اختیار کرتے ہوئے کرنا ہے، الحمدللہ بورڈ نے اب تک اسی طریقۂ کام کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔

❖ ❖ ❖

شریعت پر اپنی طرف سے پورا عمل بھی ضروری (۱)

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا جو کام ہے وہ سب مسلمانوں کا کام ہے، یہ مسئلہ حقیقت میں دین کا مسئلہ ہے، اور دین وہ طریقۂ زندگی ہے، جو پروردگار نے اپنی طرف سے بندوں کے لئے مقرر فرمایا ہے، ظاہر ہے کہ پروردگار جو چیز مقرر فرماتا ہے اس میں نہ کوتاہی کرنے کی گنجائش ہے اور نہ اس میں تغیر کرنے کا حق ہے، اس میں جو کوتاہی ہوتی ہے اس کے لئے آدمی کو استغفار کرنا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی پڑتی ہے، اور یہ امید کرنی پڑتی ہے کہ وہ معاف کردے گا، اور پھر اس پر مؤاخذہ نہ ہوگا، لیکن اگر وہ معاف نہ کرے تو اس کوتاہی پر آخرت میں مؤاخذہ ہوتا ہے۔

مختلف اسباب اور وجوہات کی بنا پر جب ہندوستان میں خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہمارا پرسنل لا، مسلمانوں کا پرسنل لا، اسلامی پرسنل لا تبدیل کیا جاسکتا ہے، اور آواز اٹھ رہی ہے کہ اس پرسنل لا میں تبدیلی کردی جائے، کمی وبیشی کردی جائے تو اس وقت ہمارے علماء کرام اور جو حضرات اہل حمیت وغیرت مند اہل دین تھے انہوں نے خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے اس کا مقابلہ کرنے کا عہد کیا، اور مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کی تاکہ اجتماعی طور پر اور آپس کے

---

(۱) ۱۸ رجنوری ۲۰۰۱ء کو جامع مسجد بنگلور میں کی گئی تقریر۔

تعاون سے، اور ایک دوسرے کی بصیرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کام کو کیا جائے، اور الحمد للہ اس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی، لیکن یہ مسئلہ مستقل مسئلہ ہے، کچھ نہ کچھ بات پیش آتی رہتی ہے، اور پیش آسکتی ہے، اس لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا کام ختم نہیں ہوا، وہ برابر جاری رہا اور جاری ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم اور اس کا فضل ہے کہ پرسنل لا بورڈ کی کوششوں کے شروع ہونے کے بعد اس میں ایک طاقت اور زور پیدا ہو گیا کہ پرسنل لا کو بدلا نہیں جاسکتا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، لوگوں کے سامنے دیگر جو مذاہب ہیں، ان مذاہب میں ایسا نہیں ہے کہ کوئی بات لازمی ہو، اور اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوسکے، بلکہ دوسرے مذاہب میں تبدیلیاں ہوئی ہیں، اور وہ تبدیلی بعض باتوں میں ان کے علماء نے کی ہے اور اسے قبول کیا ہے، لیکن مسلمانوں کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمراً أن يكون لهم الخيرة من أمرهم﴾۔ (سورہ احزاب: ۳۶)

''اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں کہ ان کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے۔''

آیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان مرد اور کسی مسلمان عورت کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی فیصلہ آئے، کوئی حکم آئے تو اسے اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے میں اختیار رہو، مسلمان کو اس کا اختیار ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے پرسنل لا میں یا ان احکام میں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو ملے ہیں، ان میں کوئی تغیر کرے، اس پر تو اس کیلئے دل سے عمل کرنا لازمی ہوگا، تبھی جا کر اس کا اسلام صحیح قرار دیا جائے گا ورنہ اس کا اسلام ہی صحیح نہیں ہے، اور صاف صاف آتا ہے کہ:

﴿فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم، ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجاً مما قضيت، ويسلموا تسليماً﴾

(سورۃ النساء:٦٥)

آدمی صاحب ایمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کو اس طرح نہ مانے کہ دل میں بھی اس کے متعلق کوئی شبہ نہ لائے، دل میں کوئی تردد نہ پیدا ہو، بلکہ اس کو تسلیم کرے، ظاہری طور پر ہی نہیں بلکہ اس کو دل سے ماننا ضروری ہے، یہی ایمان آدمی کا صحیح ایمان ہے۔

ہمیں اپنے معاملات خود دیکھنے ہوں گے

ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس میں ہم اقلیت میں ہیں، اقلیت میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری آواز میں وہ وزن اور وہ اثر نہیں ہے جو وزن اور اثر اکثریت کی آواز میں ہوتا ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ ہماری سرپرستی حکومت نہیں کرسکتی، اس لئے کہ حکومت سیکولر ہے، اور کسی مذہب کے معاملہ میں سرپرستی یا تغیر کا اسے کوئی حق نہیں ہے، ایسی صورت میں ہم کو اپنے مذہبی معاملات کو خود دیکھنا پڑے گا، اور ان کی حفاظت خود کرنی ہوگی، اور اس کے لئے دوسروں کو سمجھانے اور قانون کے حوالے سے کوشش کرنے کی جو ضرورت ہو، اور خود ہمیں اپنی زندگی کے معاملات میں جو عمل کرنے کی ضرورت ہو وہ ہمیں خود کرنا ہوگا، اگر ہم اس سلسلہ میں کوتاہی کریں گے تو پھر اس کا بقا مشکل ہے، اس کا تحفظ نہیں ہوسکتا، یہ دین جو ہم کو ملا ہے، اور یہ شریعت جو ہم دی گئی ہے صرف اس پر عمل کرنا ہی ضروری نہیں، بلکہ ہم کو اس کا تحفظ بھی کرنا ہے کہ یہ قائم رہے، اور جاری رہے، اور اس پر عمل بھی ہو، اور مسلمانوں کو تو خیر امت قرار دیا گیا ہے کہ یہ داعی امت ہے، اللہ تعالیٰ اس کام کے لئے پہلے انبیاء علیہم السلام کو ان

کی امتوں میں بھیجا کرتے تھے اور وہ اس امت کے دائرے میں اصلاح ودعوت کا کام کرتے تھے، اور ان کا زمانہ ختم ہوجانے کے بعد ان کی نبوت ختم ہوجاتی تھی، پھر دوسرے نبی کی نبوت شروع ہوجاتی تھی، یہ سلسلہ برابر قائم رہا، بہت سے انبیاء آئے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد پھر کسی نبی کے آنے کا امکان نہیں رہا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمادیا کہ اب جو دین تم کو دیا گیا ہے وہ مکمل دین ہے، اس میں کسی ترمیم کی، کسی تغیر کی ضرورت نہیں ہے، کوئی تغیر اور کوئی تبدل اس میں نہیں ہوگا اور اس کے لئے کوئی نبی بھی نہیں آئے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ کام دعوت کا کام، اصلاح کا کام اور دین کے تحفظ کا کام اس امت پر ڈال دیا گیا، اس کے لئے کوئی نبی تو نہیں آئے گا، لیکن وہ کام ختم نہیں کیا گیا، اس کام کو جاری رہنا ہے، اور قیامت تک جاری رہنا ہے، اور یہ کام امت کو کرنا ہے، اور اس طور پر کرنا ہے کہ یہ کام برابر جاری رہے، ایسا نہ ہو کہ اس میں انقطاع ہو۔

ہندوستان میں یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ یہاں یہ سلسلہ قائم رہا کہ مسلمان اپنے دین کے تحفظ کی فکر اپنے اداروں، اپنی انجمنوں اور اپنی جماعتوں کے ذریعہ سے خود کرتے رہے ہیں، ان کے ادارے پہلے بھی چلتے رہے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے، اور اس کی وجہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے، میں تو جب اس پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی جتنی مدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے دوسرے ملکوں میں اتنی مدد نہیں ہورہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں ایسی جماعتیں ہیں، ایسی انجمنیں ہیں اور ایسے ادارے ہیں جو دین کے تحفظ کی فکر کرتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کرنے والی بات ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس پر مطمئن ہوجانا صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کی برابر فکر لگی رہنی چاہئے کہ یہ کام ہوتا رہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

کا قیام اسی کی کڑی ہے اور ایک اہم کڑی ہے اور اس کا تحفظ ہونا چاہئے کہ یہ ادارہ برابر اپنا کام کرتا رہے، اور اپنا فریضہ انجام دے، ظاہر ہے کہ جو لوگ بورڈ میں کام کر رہے ہیں جن پر اس کی ذمہ داری ہے ان کی تعداد محدود ہے تنہا وہ سارا کام نہیں کر سکتے، ضرورت ہے اس بات کی کہ مسلمانوں کا عام تعاون ان کو حاصل ہو۔

بورڈ کی کوششوں میں سب کا تعاون درکار ہے

جہاں تک پسندیدگی کا تعلق ہے تو پوری امت الحمد للہ اس بات کو پسند کرتی ہے اور پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعاون کی بھی ضرورت ہے کہ بورڈ زیادہ بہتر طریقہ اور زیادہ توجہ سے کام انجام دے، اس وقت بورڈ کے سامنے جو ذمہ داریاں ہیں، اور جو کام اس نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے، اس میں آپ جانتے ہیں کہ ایک تو اصلاح معاشرہ ہے، دوسرے دار القضاء کے مسائل ہیں تیسرے مدارس کے مسائل ہیں اور دیگر دوسرے مسائل بھی ہیں۔

اگر ہم صرف اس بات پر خوش اور راضی رہیں کہ ایک بورڈ قائم ہے، اور مسلمانوں کی جماعتیں اور مسلمانوں کی انجمنیں قائم ہیں، تو یہ بات صحیح نہیں، بلکہ ہمیں اپنی زندگی کا خود جائزہ لیکر اپنی اصلاح کرنی چاہئے، اس وقت بورڈ پر یوں سمجھئے کہ بڑی ذمہ داریاں عائد ہیں، اور بورڈ کو بہت سے مسائل کا باقاعدہ سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور ان مسائل کو بڑی سمجھداری کے ساتھ، مشورہ کے ساتھ اور موضوع کے ماہرین کے تعاون سے ان کو انجام دینے کی کوشش کی جارہی ہے، اور اس میں آپ جانتے ہیں کہ جو باطل طاقتیں ہیں وہ اسلامی شریعت کو پسند نہیں کرتیں، اور اس میں تبدیلی کرنا چاہتی ہیں، وہ اپنی جگہ پر پوری کوشش کر رہی ہیں، اور اس مہم پر لگی ہوئی ہیں کہ مسلمانوں کو اس بات پر راضی کر دیا جائے کہ اپنی شریعت پر عمل کرنے کو ضروری نہ سمجھیں، اور ان

کے جونا قابل ترمیم احکام ہیں اور جونا قابل تغیر باتیں ہیں ان پر اصرار نہ کریں، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اس میں اب تک ان طاقتوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی، اور اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ان کو کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔

دین کولاحق خطرات کو محسوس کیجئے

بورڈ الحمد للہ اپنے موقف پر پوری طرح قائم ہے، اور سارے مسائل میں اس کا یہ عزم برابر جاری ہے کہ ہم شریعت کے کسی مسئلہ میں کسی ترمیم کو برداشت نہیں کریں گے، اور کسی ترمیم کو ہونے نہیں دیں گے، لیکن ہم جو چیزیں زیادہ محسوس کرتے ہیں وہ یہ کہ اسلامی معاشرہ کے اندر، مسلمانوں کے معاشرہ کے اندر اس وقت بہت خرابی آچکی ہے، اور مسلمانوں کے بعض معاشرے جو شہروں سے الگ ہیں، دیہاتوں کے معاشرے ہیں، وہاں تو مذہب سے بالکل دوری پیدا ہوتی جارہی ہے، اور جو ایسے نئے نئے مذاہب ہیں جو اسلام کو بدل دینا چاہتے ہیں، ان مذاہب کے اثرات پڑ رہے ہیں، اور جگہ جگہ ان کے مرکز قائم ہو رہے ہیں، خاص طور سے قادیانیت کا اثر بہت زیادہ پیدا ہو گیا ہے، اور اگر آپ کو تفصیلات معلوم ہوں تو آپ گھبرا جائیں، کہ دین کے تحفظ کے لئے ہم میں سے ہر ایک کو آگے بڑھنا چاہئے، اور کوشش کرنی چاہئے، فکر کرنی چاہئے کہ دین باقی رہے، اور دین میں جو لوگ تغیر پیدا کرنا چاہتے ہیں یا دین کو مٹانا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو دین اسلام سے ہٹا کر دوسرے مذاہب میں لیجانا چاہتے ہیں ان کو کس طرح روکا جائے؟ کس طرح ان کا مقابلہ کیا جائے؟ یہ بہت بڑا فتنہ ہے، وہ مسلمان جو شہروں میں رہتے ہیں تھوڑے بہت دین سے تعلق رکھتے ہیں اور دین کی اہمیت سمجھتے ہیں، اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ سب خیریت ہے، اور اسلام اس ملک میں ٹھیک ٹھاک ہے، ایسی بات نہیں ہے، بلکہ بہت

خطرات اس وقت پیدا ہو گئے ہیں، اور بڑا انحراف دین سے پیدا ہو گیا ہے، خاص طور سے ان علاقوں میں جہاں مدارس نہیں ہیں، جہاں دین کی دعوت دینے والے نہیں پہونچ رہے ہیں، جہاں ایسے لوگ نہیں جو دین کے تحفظ کی فکر کرتے ہوں، ایسی سوسائٹیوں میں، ایسے معاشروں میں بہت زیادہ انحراف پیدا ہو گیا ہے اور پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے، اور یہ ایسی جگہوں میں ہو رہا ہے جہاں آدمی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں ایسی باتیں ہو سکتی ہیں، ان جگہوں پر بھی ایسا ہو رہا ہے۔

صرف تمنا کافی نہیں

آپ اس بڑے شہر میں رہتے ہیں، آپ کے پاس بہت زیادہ وسائل ہیں، دین کے تحفظ کا کام آپ اپنے ذمہ لے سکتے ہیں، اور دین کے تحفظ کے کام کی جو ذمہ داری ہے وہ ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے، آپ اس کی طرف توجہ دے سکتے ہیں، اس لئے آپ اس کو بھی پیش نظر رکھیں، صرف تمنا کرنا اور خواہش کرنا کافی نہیں ہے، ہم لوگوں میں اکثر لوگ صرف تمنا اور خواہش پر ہی زندگی گذار رہے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں، ان کا دل چاہتا ہے کہ ایسا ہو، دین محفوظ رہے، شریعت محفوظ رہے، پرسنل لا محفوظ رہے، ان کی تمنا ہوتی ہے، لیکن صرف تمنا سے کام نہیں چلتا بلکہ کچھ توجہ کرنی پڑتی ہے، محنت کرنی پڑتی ہے، اس کام کو آپ صرف علماء کا کام سمجھ کر چھوڑ نہ دیں، بلکہ یہ سب کے کرنے کا کام ہے، صرف علماء کا نہیں، یہ سمجھنا کہ علماء کی اور خواص کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، اگرچہ صحیح ہے، لیکن یہ عوام کا بھی کام ہے، ہر ایک کو اس بات کی فکر کرنی چاہئے کہ اس کا معاشرہ درست ہو، اس کے معاشرہ میں بھی اللہ اور اس کے رسول کے حکموں کی پابندی کی جائے، اور جو اس کا معاشرہ نہیں ہے، بلکہ اس کے پڑوس کا معاشرہ ہے، اس کے قریب کا معاشرہ ہے، اس کے ملک کے دوسرے خطوں کا

معاشرہ ہے، اس کو اس بات کی فکر ہو کہ وہاں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا دین قائم رہے، اور اللہ تعالیٰ کے حکموں پر عمل کیا جائے، اور کم سے کم یہ کہ وہ صحیح عقیدہ پر قائم رہے، اور اسلام کے دائرہ کے اندر رہے، اس سے نکل نہ جائے، اس لئے کہ اگر یہ چیز خطرہ کی صورت میں جو سارے ملک میں پھیلتی جارہی ہے اگر یہ جاری رہی اور اس کی فکر نہیں کی گئی تو ہمارے سامنے تاریخ کی مثالیں ہیں کہ دنیا میں بعض ملک ایسے ہیں جہاں سے اسلام بالکل خارج ہوگیا۔

میں نے بخاریٰ اور سمرقند وغیرہ کا ایک موقع پر دورہ کیا تو وہاں معلوم ہوا کہ ایسی ہی کیفیت تھی، وہاں کے رہنے والے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن اسلام کے بارے میں ان کو کچھ بھی معلوم نہیں، یعنی اگر ان سے کہا جائے کہ نماز پڑھو، تو وہ نہیں پڑھ سکتے، وہ یہ تک نہیں جانتے کہ نماز میں سجدہ کیا ہوتا ہے، رکوع میں کیا ہوتا ہے، حتیٰ کہ سورہ فاتحہ اور کلمہ تک نہیں جانتے، اس لئے ان کے سامنے وہ چیزیں آئیں نہیں، اور وہاں کوششیں اس کے خلاف کی گئیں، دین کے خلاف کی گئیں، اور وہ کوششیں کامیاب ہوگئیں، یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں لیکن اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا، اور ان کو اسلام کی معلومات بھی نہیں رہیں، یہ چیزیں دوسروں کو ڈرانے والی ہیں، ان دوسرے ملکوں کو ڈرانے والی ہیں، جہاں اسلام پر عمل ہورہا ہے، جہاں اسلام قائم ہے، لیکن ان کو ڈرنا چاہئے، اس لئے کہ نسل بدل جانے کے بعد حالات بدل جاتے ہیں۔

نسل نو کی فکر کیجئے

ہمارے بڑوں کی جو نسل تھی، ہمارے باپ دادا کی جو نسل تھی ان کے حالات دوسرے تھے، ہماری جو نسل ہے، ہم جس نسل میں ہیں اس کے حالات دوسرے ہیں،

اور آئندہ جو نسل آئے گی اس کے حالات دوسرے ہوں گے، آج کے حالات پر آئندہ کے حالات کا قیاس نہیں کیا جا سکتا، بلکہ حالات کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے، آپ سمجھئے کہ آپ یہاں مسجد میں جمع ہیں اور یہ دینداری کی جو کیفیت نظر آرہی ہے، یہ آپ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ آپ کے باپ اور چچا کی محنتوں کا نتیجہ ہے، آپ کے باپ چچا نے ایسا ماحول بنایا جس سے یہ دین قائم رہا، آپ کے مسلمان رہنے کی انہوں نے فکر کی، لیکن آئندہ جو نسل آئے گی اس کی فکر آپ کو کرنی ہوگی، آپ اگر دین کے باقی رہنے اور دین کے رائج ہونے کی فکر نہیں کریں گے تو آپ کی آئندہ آنے والی نسل دیندار نہیں ہوگی، بلکہ اس کا خطرہ ہے کہ دین سے بالکل واقف نہ ہو، آپ جتنا اس کو واقف کرا سکیں گے اتنا ہی وہ واقف ہوگی، آپ اس کے دین کے تحفظ کی جتنی فکر کریں گے اتنا اس کا تحفظ ہوگا، ورنہ وہ ایسی نہیں ہوگی جیسی آپ کی تمنا اور خواہش ہے، تمنا اور خواہش سے کام نہیں چلتا، آپ بیٹھے بیٹھے تمنا کرتے رہیں کہ آپ کی اولاد اور اولاد کی اولاد بڑی نیک ہو، وہ اسلام پر قائم رہے، اور اسلام کی اس میں حمیت و غیرت ہو، تو اس تمنا سے کام نہیں چلے گا، اس کے لئے انتظام کرنا پڑے گا، اس کے لئے فکر کرنی پڑے گی۔

شریعت اپنی زندگیوں میں نافذ کریں

دوسرے پر اگر ہم زور دیتے ہیں، اور اس میں ہم کامیاب ہو جاتے ہیں کہ دوسرا کوئی ہمارے دین کے اندر نقص نہ نکالے، ہمارے دین کے تحفظ کے خلاف کوئی کاروائی نہ کرے، اور ہماری شریعت میں کوئی ترمیم نہ کرے، اس میں اگر ہم کامیاب ہو جاتے ہیں، تو تنہا یہ کامیابی پوری کامیابی نہیں ہے، دین کا تحفظ عملاً بھی تو ہونا چاہئے، اس شریعت پر پوری طرح عمل بھی تو ہونا چاہئے، شریعت محض کاغذ پر لکھنے کے

لئے نہیں، شریعت قرآن کے اندر موجود ہے، حدیث شریف کے اندر موجود ہے، اس کو ہماری زندگیوں میں آنا چاہئے، ہماری زندگی اس کے مطابق ہونی چاہئے، اور ہمیں ہر وقت اس بات کی فکر رکھنی چاہئے کہ ہماری شریعت میں کوئی تغیر و تبدیلی نہ ہو، تبدیلی کہاں ہو؟ ہماری زندگیوں میں، ہم شر سے خیر کی طرف آئیں، برائی سے توبہ کریں، بھلائی سے رشتہ جوڑیں، غفلت کی زندگی چھوڑ دیں، اور اک وشعور والی زندگی گذاریں، اس میں تبدیلی ہونی چاہئے، یہ کام اگر چہ تلخ ہے، اگر چہ محنت کا ہے، اور قربانی کا ہے، لیکن یہ کام ہم سب کو کرنا چاہئے، ہم کو اس کی فکر کرنی چاہئے کہ خود ہماری زندگیوں میں اسلام صحیح طور سے نافذ ہو۔

ہماری یہ زندگی ہمیشہ رہنے والی زندگی نہیں ہے، یہ زندگی کتنے دن کی ہے؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آدمی دنیا میں ایک محدود وقت گذار کر چلا جاتا ہے، اور خالی ہاتھ جاتا ہے، کچھ لیکر نہیں جاتا، صرف عمل لے کر جاتا ہے، وہ عمل جو اس نے زندگی بھر کئے ہیں، اس نے اپنے اللہ اور رسول کے حکموں پر عمل کیا، اپنے اللہ کو راضی کیا یا نہیں؟ یہ لے کر جاتا ہے، یہ نہیں کہ صرف تمنا لے کر جائے، یا امید اور خواہش لے کر جائے، یہ خواہش، امید اور تمنا لے جانے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ عمل لیجانے سے کام چلے گا، عمل اسی وقت لے جاسکتے ہیں جب ہم اپنی زندگیوں پر اللہ کے حکموں کو نافذ کریں، اللہ کے رسول کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کریں، اور اپنے دین کو مکمل طریقہ سے اختیار کریں، دین کو اس طریقہ سے نہیں کہ ہم اس کا کچھ حصہ اختیار کرلیں، اور کچھ حصہ اختیار نہ کریں۔

اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ

آپ دیکھئے کہ مسلمان عام طور پر نماز روزہ تو کرلیں گے، اگر چہ وہ بھی سب نہیں کرتے، لیکن جو معاشرتی مسائل ہیں، جو آپس کے اجتماعی اور سماجی مسائل ہیں

ان میں مسلمان میں بہت زیادہ غفلت ہے، وہ میراث کی تقسیم نہیں کریں گے، شادیوں میں اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق عمل نہیں کریں گے، بلکہ رواج کے مطابق، اور اپنی خواہش کے مطابق عمل کریں گے، اور پھر اس کے بعد جو شوہر اور بیوی کے تعلقات ہوتے ہیں ان میں بھی اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق عمل کریں گے، اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو نہیں معلوم کریں گے، ہم صرف بعض باتوں میں دین پر عمل کرتے ہیں، لیکن اکثر باتوں میں ہم دین کو نظر انداز کردیتے ہیں، اللہ کے حکم کو نظر انداز کردیتے ہیں، شریعت پر ہم عمل نہیں کرتے، ان پر ہم اپنے رواج کے مطابق عمل کرتے ہیں، اپنے پڑوسیوں کو دیکھ کر ان کے طریقے اختیار کرلیتے ہیں، اپنی من مانی کرتے ہیں، اللہ کے حکموں پر عمل نہیں کرتے، پورا دین ہمیں اختیار کرنا پڑے گا، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، یہ نہیں کہ کچھ حصہ لو اور کچھ حصہ نہ لو، آج ہماری زندگی اس سلسلہ میں بڑی ناقص زندگی ہے، آپ اپنا ہم اپنا جائزہ لیں، اپنے پڑوسیوں کا جائزہ لیں، اپنے بھائیوں کا جائزہ لیں تو ہم کو یہ بات نظر آئے گی کہ دین پر پورا عمل نہیں ہوتا، اور خاص طور سے معاشرتی معاملات میں، سماجی معاملات میں اور ان معاملات میں جن کے تحفظ کے لئے ہم لڑائی لڑ رہے ہیں اور جن کے لئے بورڈ اپنی کوشش صرف کررہا ہے، اور جنہیں آپ کی حمایت حاصل ہے، آپ اس کو پس پشت ڈال رہے ہیں، ہم اپنی زندگی میں اس کو نافذ نہیں کرتے۔

ہمارا معاشرہ اسلامی معاشرہ بنے

ہمارا دین محض نماز روزہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ آپس کے جو تعلقات ہیں، سماجی مسائل ہیں، اور گھر کے اندر اور خاندان کے اندر آپس کے تعلقات کے سلسلہ میں شریعت کے جو احکام ہیں ان کو بھی نافذ کرنا چاہئے، اور اپنے معاشرہ کو اسلامی

معاشرہ بنانا چاہئے، ایسا معاشرہ بنانا چاہئے کہ جس کو دیکھ کر ہم بھی مطمئن ہوں، اور ہمارے جو پڑوسی ہیں، جو اسلام پر یقین نہیں رکھتے، وہ بھی معاشرہ کو دیکھ کر اسے پسند کریں، اور ان کے اندر خود اس بات کا داعیہ پیدا ہو کہ بڑا اچھا معاشرہ ہے، اس کے طور طریق ہم کو اختیار کرنے چاہئیں، سچی بات یہ ہے کہ اگر آپ اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام اصلاً عمل سے پھیلا ہے، مسلمانوں نے اپنے معاشرہ کو اللہ اور اس کے رسول کے حکموں کے مطابق جتنا اچھا، صاف ستھرا اور جتنا رحم دلی کا، ہمدردی کا اور انسانیت دوستی کا معاشرہ بنایا، اس کو دیکھ کر لوگ متاثر ہوئے، اس کو دیکھ کر مسلمانوں کی تعداد دنیا میں بڑھی، اصل وہ چیز ہے جو ہمارے یہاں ناپید ہوتی چلی جارہی ہے، اس لئے دین کی دعوت کا کام رکتا چلا جارہا ہے، جس کی ذمہ داری ہم سب پر ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی زندگی کا جائزہ لے کر ان خرابیوں کو، ان برائیوں کو دور کریں جو اللہ اور اس کے رسول کو ناراض کرنے والی ہیں، اس لئے کہ خدانخواستہ اگر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے تو اس کا وبال ہم سب پر پڑے گا، اور جو مصائب آتے ہیں ہم ان پر غور نہیں کرتے، بہت سے مصائب اس وجہ سے پیش آتے ہیں کہ اللہ کے حکموں کو پامال کیا جاتا ہے، اللہ کی رضا کے خلاف کام کیا جاتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر پکڑ فرماتا ہے، اس لئے اگر ہم اپنی راحت کا سامان چاہتے ہیں، اپنے مستقبل کو خوش گوار بنانا چاہتے ہیں، عافیت وسلامتی کا بنانا چاہتے ہیں، اور نعمت کا، رحمت کا مستقبل بنانا چاہتے ہیں تو ہم کو اللہ اور اس کے رسول کے حکموں کو معلوم کر کے ان کو اپنی زندگیوں میں نافذ کرنا ہوگا جب ہم ان کو عمل میں لائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہوں گے، اس بات کی بھی ہمت ہوگی کہ ہم دوسروں سے کہہ سکیں کہ دیکھو یہ چیز کتنی بہتر ہے؟

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم کو اور آپ سب کو اپنی رضا کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس ملک میں مسلمان ایسی زندگی گذاریں جو دوسروں کے لئے بھی دعوت کی زندگی ہو، دوسروں کو متوجہ کرنے والی ہو اور دوسروں کو مائل کرنے والی ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے، البتہ ہم لوگوں کو ہمت کرنے کی اور فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

❖ ❖ ❖

ہم دین کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کریں [1]

میرے لئے سعادت اور مسرت کی بات ہے کہ مجھے یہاں حاضر ہونے اور آپ سے خطاب کرنے کا موقع ملا، حقیقت یہ ہے کہ آپ سبھی حضرات ملت کے بارے میں اچھا جذبہ رکھتے ہیں، اور دینی کاموں میں شریک ہوتے ہیں، آپ اس موقع پر تشریف لائے تا کہ دین کی باتیں سنیں، یہ بھی آپ کے دینی جذبہ کا ثبوت ہے، آپ کا یہاں اور اس وقت اتنی بڑی تعداد میں دین کی باتیں سننے کے لئے جمع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک اس کی اہمیت ہے، اور آپ اس کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں، اگر آپ کے نزدیک اس کی اہمیت نہ ہوتی تو آپ یہاں نہ آتے، انشاء اللہ آپ کو یہاں آنے، اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرنے اور دین کی باتیں سننے کا اجر ملے گا، یہ پسندیدہ عمل اور مقبول عمل ہے، اور اللہ کے یہاں اس پر اجر ملتا ہے، یہ ذکر خدا و رسول اور پند و موعظت کی مجلسیں فائدہ سے خالی نہیں ہوتیں، حدیث شریف میں آتا ہے:

﴿لا يقعد قوم يذكرون الله عز وجل إلا حفتهم الملائكة، وغشيتهم الرحمة، ونزلت عليهم السكينة، وذكرهم الله فيمن

---

(۱) دھنباد میں کی گئی تقریر۔

عندہ﴾ (مسلم شریف)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو جماعت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو فرشتے اس جماعت کو گھیر لیتے ہیں، رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، سکینت ان پر نازل ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ فرشتوں کی مجلس میں فرماتے ہیں۔''

اس حدیث شریف کی رو سے آپ اس وقت فرشتوں کے جھرمٹ میں اور اللہ کی رحمت کے سایہ میں ہیں، اور اللہ تعالیٰ ملأ اعلیٰ اور فرشتوں کی مجلس میں آپ کا تذکرہ فرما رہے ہوں گے، اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی؟

اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا دونوں بنائے ہیں، اور دونوں سے متعلق احکامات دیئے ہیں، حدیث میں آتا ہے: ﴿الدنيا مزرعة الآخرة﴾ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، نیز یہ دنیا دار العمل اور آخرت دار الجزاء ہے، دین کا تعلق آخرت سے ہے، اور مسلمان اس دنیا میں عمل کرتا ہے تا کہ آخرت میں اس کو اس کا فائدہ پہونچے، ہماری زندگی کی نوعیت دوہری ہے، ایک کا تعلق دنیا سے ہے، اور دوسری کا تعلق دین سے، لیکن دنیوی معاملات میں بھی نیت اگر اچھی ہو تو دنیا دین بن جاتی ہے، جب کہ دنیا کے معاملات میں بھی اللہ کی رضا، سنت کی پیروی اور اللہ کے حکم کو پورا کرنے کی نیت ہو، اتنی بڑی تعداد میں آپ یہاں تشریف لائے ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی نیت اچھی ہے، اور ﴿إنما الأعمال بالنيات﴾ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، آپ دین کی باتیں سننے کے لئے آئے ہیں، انشاء اللہ آپ کو اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے گا۔

دین کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے میں اس امت نے اپنا ایک وقار قائم کر رکھا ہے، دین کے معاملہ میں ہر طرح کی قربانی دینا، خواہ وہ جان کی قربانی ہو یا مال کی یا وقت کی، اس امت کا شعار ہے، اور اس میں یہ امت ممتاز ہے، دنیا کی کسی اور

قوم مین یہ بات نہیں ہے کہ وہ اپنے مذہب کے لئے اتنی قربانی دے، یہ اس امت کے خیر امت ہونے کی دلیل ہے، اور اس سے کامیابی کی طرف اشارہ ملتا ہے، اگر چہ مسلمانوں میں انفرادی طور پر بعض خرابیاں پائی جاتی ہیں، لیکن من حیث القوم یہ امت دین سے جڑی ہوئی اور اس سے وابستہ ہے، بعض خرابیوں کو دیکھ کر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ مسلمانوں میں دین کا جذبہ موجود ہے، اور جب جذبہ ہو، اور دین کے لئے کوشش ہو تو اللہ کی طرف سے مدد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا﴾۔ (سورۃ العنکبوت:۶۹)

"یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں، ہم ان کو اپنے (قرب وثواب یعنی جنت کے) رستے ضرور دکھاویں گے۔"

اور بیشک اللہ تعالیٰ ایسے اخلاص والوں کے ساتھ ہے، لیکن ہر چیز کا تعلق آدمی کے ارادہ اور اس کی نیت سے ہوتا ہے، ارادہ ہو تو مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے، اگر اس امت میں ارادہ پیدا ہو جائے تو اس کی خرابیاں خود بخود دور ہو جائیں، اور یہ دین کے راستہ پر چل پڑے۔

ابھی میرے تعارف کے سلسلہ میں آپ کے سامنے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا تذکرہ آیا، چونکہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی ذمہ داری مجھ پر ہے، اور میں بھی اس کا ایک خادم ہوں، اس لئے اس کے تعلق سے کچھ باتیں عرض کرتا ہوں۔

یہ پرسنل لا کیا ہے؟ ہمیں اس کی اہمیت اور ضرورت سمجھنا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے یہ نظام بنایا ہے کہ ہر کام میں اللہ کی رضا پیش نظر رہے، اور سنت کی پیروی ہو، شریعت کے جو احکام ضروری ہیں ہر مسلمان کو ان پر عمل کرنا چاہئے، ان میں سے کچھ احکام انفرادی ہیں، جیسے نماز، روزہ وغیرہ، اور کچھ اجتماعی اور سماجی ہیں، جیسے میراث، نکاح وطلاق وغیرہ، اور پرسنل لا کا اصلی میدان یہی اجتماعی اور سماجی احکام ہیں، اور

یہی مسائل اس میں زیر بحث آتے ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں یہ مسئلہ اٹھا کہ سارے ملک کے لئے یکساں سول کوڈ نافذ ہو، جو مسلموں اور غیر مسلموں سب کے لئے واجب العمل ہو، اس میں دینی ودنیاوی دونوں طرح کے معاملات داخل تھے، یہ بہت بڑا خطرہ تھا، اس میں ہمارے دین کو بدل دینے کی کوشش اور سازش تھی، ہمارے علماء نے اس کو محسوس کیا، اور یہ بورڈ قائم کیا تا کہ اس کے ذریعہ اجتماعی کوشش کی جائے، اور کسی بھی کام میں اجتماعی کوشش کا فائدہ ہوتا ہے، چنانچہ بورڈ کو کامیابی ملی، اور اس کی کوششوں کے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں، اب مسلمانوں کا کام ہے کہ بورڈ کو اپنے مقاصد میں ان سے تعاون ملے، تعاون دو طرح کا ہوتا ہے، ایک تعاون مادی ہوتا ہے وہ بھی مسلمانوں کو کرنا چاہئے، اور ماشاء اللہ کر رہے ہیں، اور ایک تعاون معنوی ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان اپنے عمل سے شریعت کا تحفظ کریں، ایسا نہ ہو کہ ہم حکومت سے اور دسروں سے پرسنل لا کی حفاظت کا اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کئے جانے کا مطالبہ کریں اور خود اس سے انحراف کریں، ایسی صورت میں ہماری آواز میں وزن نہیں رہے گا، اس لئے ضرورت ہے کہ ہماری زندگی میں شریعت کا تحفظ ہو، اور یہ تحفظ اس طرح ہوگا کہ ہم علماء کرام سے مسائل معلوم کر کے ان پر عمل کریں، یہ دین اسی وجہ سے باقی ہے، اور اسی طرح باقی رہے گا کہ اس پر عمل ہو، یہ دین جواب تک بدل نہیں سکا، تو اس کی وجہ یہی ہے، جب کہ دوسرے ادیان و مذاہب بدل گئے، خود ان کے ماننے والوں نے انہیں بدل دیا، اور وہ اس طرح کہ آسان احکام پر تو عمل کیا اور مشکل احکام کو چھوڑ دیا، اس لئے دوسرے ادیان و مذاہب سب کے سب بدل گئے سوائے اسلام کے۔

یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ باوجود شمنان اسلام کی ساری کوششوں کے بدل نہیں سکا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون﴾۔ (سورۃ الحجر:۹)

''ہم نے قرآن نازل کیا ہے، اور ہم اس کے محافظ ہیں۔''

اس طرح گویا اللہ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے کہ دین کی حفاظت کرے گا، اور اس کے ماننے والوں کی بھی حفاظت کرے گا، بلکہ ہر اس چیز کی حفاظت کرے گا جس کا تعلق کتاب اللہ سے ہو، تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں پر بہت سخت حالات آئے لیکن وہ باقی رہے، اور دین میں تحریف کی ساری کوششیں ناکام ہوئیں، خود ہمارے ملک ہندوستان میں تقسیم کے وقت حالات اتنے خراب تھے کہ مسلمانوں پر زمین تنگ ہوگئی تھی، بظاہر ان کا اس ملک میں رہنا مشکل تھا، لیکن اللہ کا فیصلہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں رہیں گے، اور الحمدللہ ہیں، بلکہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ پوری دنیا میں مسلمان باقی رہیں گے، قرآن کریم سے جن جن کا تعلق ہے سب کی حفاظت کرنے کا اللہ نے وعدہ فرمالیا ہے، سارے اسباب ووسائل قرآن کی حفاظت کے مقرر ہوئے، اس پر عمل کرنا یہ بھی اس کی حفاظت ہے۔

اس امت کے ساتھ جو حوادث پیش آتے ہیں ان کی حیثیت امراض کی ہے، امراض دوا، علاج سے اچھے ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ حوادث بھی علاج سے جاتے رہیں گے، اور ان کا علاج دین پر اور شریعت پر عمل کرنا ہے، اس امت کی تاریخ میں بارہا ایسا محسوس ہوا کہ شاید اب یہ امت ختم ہو جائے گی لیکن یہ پھر ابھر آئی، اور اپنی زندگی کا ثبوت دیا، اسی کو علامہ اقبال نے کہا ہے:

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اس خطہ میں دین کے نام پر اتنے آدمیوں کا جمع ہو جانا دین کا ایک معجزہ ہے، باوجود گناہ اور معاصی کے آپ کچھ افراد کو ضرور دین پر عمل کرنے والا پائیں گے،

انہیں کے طفیل میں دنیا میں برکتیں نازل ہوتی ہیں نعمتیں نازل ہوتی ہیں، ہم ان کے ممنون ہیں جو دین کے لئے اور اللہ کی رضا کے لئے کام کرتے ہیں، تعلیمات قرآن کو اپنی زندگی میں جاری کرنا اور سنت سے احکام اور اس کا طریقہ معلوم کرنا یہ دین کی حفاظت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم دی ہے اگر ہم اس کا جائزہ لیں تو وہ ہمیں اپنی اصلی شکل میں ملے گی، طریقہ وہی ہے، صورت شکل وہی ہے، اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی، ہاں ایمان کی، اخلاص اور جذبہ کی کمزوری ہوسکتی ہے، لیکن طریقہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، اس سے دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، اور دین کی حفاظت ہوتی ہے۔

ہماری بقا قرآن وسنت سے مربوط ہے، یہ امت جب تک دین سے وابستہ رہے گی تب تک باقی رہے گی، ہم دین سے جتنے دور ہوں گے خطرہ اتنا ہی بڑھے گا، مسلمانوں پر جب بھی مصیبت آئی ہے ان کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں آئی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم﴾۔ (سورۃ الشوریٰ:۳۰)

''اور تم کو (اے گنہگارو!) جو کچھ مصیبت پہونچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہونچتی ہے۔''

جہاں دین پر صحیح طور پر عمل ہوتا ہے وہاں امتحانات ومصائب بہت کم پیش آتے ہیں، ہم جو اب تک زندہ ہیں، تو ہمارے بزرگوں نے جو اصلاح کا کام کیا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے، جنہوں نے محنت کی اور باہر سے آئے، لوگوں سے ملے تاکہ دین باقی رہے، یہ ان کی محنت کا صلہ ہے کہ ہم اس ملک میں عزت کے ساتھ ہیں، لیکن اسے یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ہمیشہ باقی نہیں رہے گا، ہمارے لئے ہمارے بزرگوں نے محنت کی، اب ہمیں اپنے بعد آنے والی نسل کے لئے محنت کرنی ہے، ہم نئی نسل کی تربیت کریں،

ان کی اصلاح کریں، انہیں دین کے راستہ پر لگائیں، اسی میں ہماری بقا اور ہماری زندگی ہے، یہ اللہ کا کرم ہے کہ ہم زندہ ہیں، اور فائدہ اٹھا رہے ہیں، اگر ہم دین پر عمل کریں، اور اپنی زندگیوں میں شریعت کو نافذ کریں تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے زیادہ عزت عطا فرمائے گا، لیکن کوتاہی کی صورت میں مسائل اور مصائب پیش آئیں گے، اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہے، وہ اپنے دین کی حفاظت کا کام کسی سے بھی لے سکتا ہے، ہم نہیں ہوں گے لیکن یہ دین باقی رہے گا، ہمارے لئے سعادت کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ذریعہ سے اپنے دین کی حفاظت اور بقا کا کام لے، تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ بعض ممالک میں مسلمان بالکل ختم کر دیئے گئے، جب کہ انہوں نے دین پر عمل کرنا چھوڑ دیا، یہ بات ذہن میں بٹھانے کی ہے کہ ہمارے معاملہ میں کامیابی و عزت اور زندگی و بقا سب دین کے ساتھ مربوط ہے۔

یہ جو جلسے جلوس ہوتے ہیں، اجتماعات اور کانفرنسیں ہوتی ہیں ان کا نتیجہ نکلنا چاہئے، ان کا کم از کم یہ فائدہ ضرور ہونا چاہئے کہ ہمارے اندر ارادہ پیدا ہو جائے، دین کی فکر پیدا ہو جائے اور اس بات کی فکر کہ ہم دین کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں نافذ کریں، اس سے اللہ کی نعمتیں نازل ہوں گی، اور ہم عزت سے رہیں گے، اور ہمارا یہ مقام صدیوں رہ چکا ہے، ضرورت ہے کہ ہم پھر اس مقام کے لائق بنیں، دنیا کی قیادت کے اہل بنیں، اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم دین کو نافذ کرنے کا ارادہ کریں اور اللہ کی نعمتوں اور برکتوں کے مستحق ہوں، اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے نیک ارادوں میں کامیاب فرمائیں۔

❖ ❖ ❖

شریعت پر عمل ہی مسائل کا حل ہے

مسلمان اور مسلم اپنے معنی کے اعتبار سے اس شخص کو متعین کرتا ہے جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے حکم و مرضی کے حوالہ کر دے، عربی زبان میں اسلام کے معنی حوالہ کر دینے، سپرد کر دینے کے ہیں، اس طرح اصلاً مسلم اس شخص کو کہیں گے جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے حکموں کے سپرد کر دیا کہ ہم وہی کریں گے جو ہمارا پروردگار چاہتا ہے، ہم وہی کریں گے جس کی پروردگار نے ہم کو اجازت دی ہے، جب ہمیں خود سپردگی یعنی اپنے کو اپنے رب کی مرضی کے حوالہ کرنا ہے تو ہم کو یہ جاننے کی ضرورت ہوگی کہ ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟ کیا حکم دیا ہے؟ اور کس طرح کا عمل وہ ہماری زندگی کے لئے پسند کرتا ہے؟

لیکن ہو یہ رہا ہے کہ محض مسلمان گھر میں پیدا ہو جانے پر مسلمان عموماً مطمئن ہو جاتا ہے، اور محض اس بات پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم مسلم ہیں اور جب ہم مسلم ہیں تو اللہ پر گویا ہمارا یہ حق بن جاتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ضرور رحم اور عنایت و مدد کا معاملہ کرے کیونکہ ہم مسلم ہیں لیکن اس بات کو عام طور پر بھلا دیا جاتا ہے کہ مسلمان (مسلم) کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمان ماں باپ کے یہاں پیدا ہو گیا، بلکہ مسلمان کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے سپرد کر دیا، لہذا ہم اپنی

زندگی کا جائزہ لیں کہ کیا ہم نے اپنے کو اللہ کے حکم کے سپرد کیا ہے؟ یعنی اپنی مرضی پر اپنے پروردگار کی مرضی کو ترجیح دی ہے؟ مسلمان کی شان یہ بتائی گئی ہے، بلکہ اس کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت ہو کہ وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ اپنی اولاد سے بھی زیادہ اور اپنے گھر والوں سے بھی زیادہ ہو، حدیث میں آتا ہے:

﴿لا یؤمن أحدکم حتی أکون أحب إلیه من والده وولده والناس أجمعین﴾

اور جب ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت ہوگی تو ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی ہم خلاف ورزی نہیں کر سکتے، بلکہ ہم کوئی بھی ایسا عمل نہیں کر سکتے جو ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت وارشاد کے خلاف ہو، یا جس کو آپ نے ناپسند کیا ہو، اور اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کے خلاف کوئی کام کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہمیں اصلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ محبت نہیں ہے جس محبت کا ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ یہ محبت اپنی اولاد اور اپنے ماں باپ کی محبت سے بھی زیادہ ہو۔

اس سلسلہ میں اولاً یہ ضروری ہے کہ ہمیں ان احکام کو معلوم کرنا چاہئے جن احکام پر عمل کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل حکم ہے، اور جن پر عمل کئے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری محبت ثابت نہیں ہوتی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اگر ہم کو حاصل نہیں ہے تو آخرت میں ہم کو کیا فائدہ حاصل ہو سکے گا؟ آخرت میں نجات اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ ہم کو آپ کے حکموں پر چلنا ضروری ہے۔

صرف احکام معلوم کر لینے سے کام نہیں چلتا، مسائل کو جاننا ضروری اس

لئے ہے کہ اس کے ذریعہ ہی ہم عمل کر سکتے ہیں، لیکن اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہماری زندگی میں وہ احکام نافذ ہوں اور ہماری زندگی میں ان کا عمل دخل ہو، اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت، مدد، رحمت اور کرم کا وعدہ اچھے اعمال پر کیا ہے، اچھے اعمال کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکموں کی تعمیل کی جائے، اور جب ایسا طریقہ اختیار کیا جائے گا تب ہی اللہ کی مدد، اللہ کی نصرت، اللہ کا کرم ہم پر ہوگا، اور اگر خدانخواستہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکموں کی پابندی نہیں کرتے، بلکہ انہیں نظر انداز کرتے ہیں، اللہ کے رسول کی ہدایات کے خلاف کرتے ہیں تو پھر ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے کرم کی توقع نہیں رکھنی چاہئے، ہم اس کی نافرمانی کریں وہ ہم پر کرم کرے، یہ کیسے ہوگا؟ کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ ہمیں اپنی زندگی کا اصل میں جائزہ لینا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے حکموں پر کہاں تک عمل کر رہے ہیں؟ ہم ان کی مرضی کو اپنی مرضی پر کہاں کہاں ترجیح دے رہے ہیں؟ اگر ان کی مرضی کو ہم اپنی مرضی پر ترجیح نہیں دیتے تو یہ اطاعت نہیں کہلائے گی، اطاعت وہاں کہلائے گی جہاں ہم اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کو ہر چیز پر ترجیح دیں، خرچ کا معاملہ ہو، آمدنی کا معاملہ ہو، کسی سے معاملہ کرنے کی بات ہو، یا کوئی اور معاملہ ہو، زندگی کے بیشمار پہلو ہیں، ہمیں ہر پہلو میں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ہم اللہ کی مرضی کو ترجیح دیں، اور جس حد تک ہم اللہ اور اس کے رسول کی مرضی پر عمل کریں گے اسی حد تک اللہ کی نصرت، اس کی مدد اور اس کا کرم ہم کو حاصل ہوگا، اور اگر ہم اسلام کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہم کو یہ بات نظر آئے گی کہ جب تک مسلمانوں نے اچھی زندگی کا ثبوت دیا تب تک انہیں اللہ کی مدد و نصرت اور کرم حاصل ہوا، قرآن مجید میں صاف صاف اللہ کا وعدہ ہے کہ تم اگر اچھے عمل کرو گے تو ہم تم کو نہال کر دیں گے اور برے عمل کرو گے تو تمہارا مؤاخذہ کریں گے اور تم کو سزا دیں گے، اور مسلمانوں

کے حالات بتاتے ہیں کہ ان کی مشکلات، ان کی پریشانیاں، ان کے نقصانات اور ان کی بے عزتیاں جہاں بھی ہم کو ملتی ہیں ہم ان کے متعلق تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی نافرمانیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ تھا، یہاں انسان کا معاملہ اپنے رب سے ہے، اس نے اگر اپنے رب کی نافرمانی نہیں کی تو حالات بدل جاتے ہیں، یہ سارا عالم اللہ تعالیٰ کا غلام ہے، یہ دنیا اور سارا عالم ہمارے لئے اسی وقت سازگار ہوگا جب ہم اللہ کے حکموں کے ساتھ اپنے حالات کو سازگار بنائیں گے۔

لہٰذا اصل ضرورت یہ ہے کہ ہم علماء سے مسائل معلوم کر کے اپنی زندگیوں کو اللہ اور اس کے رسول کے حکموں کا پابند بنائیں، اور جو مسائل ہیں، ان کے جو شرعی حل ہیں اور شریعت اسلامیہ میں ان کا جو طریقہ بتایا گیا ہم ان کو سمجھ کر ان کو اپنائیں۔

آپ تاریخ پڑھ ڈالئے، آپ دیکھیں گے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ عروج وزوال کی تاریخ رہی ہے، بڑے مسائل بھی پیش آئے ہیں، بڑے اچھے حالات بھی پیش آئے ہیں، ان کا آپ جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ جب اللہ کی مرضی کے مطابق زندگیاں گزری ہیں تو اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوئی ہیں اور عزت ملی ہے اور جب نافرمانی کی ہے تو مسائل اور دشواریاں، مشکلات اور پریشانیاں سامنے آئی ہیں۔

آج امت کا حال یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے حکموں کی فرمانبرداری میں اس کو جس معیار پر ہونا چاہئے اس وقت اس معیار پر نہیں ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگی میں طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں، اگر ہم ان پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں ہماری بے توجہی کو بہت دخل ہے، ہم کو چاہئے کہ ہم خود اپنی زندگیوں کا جائزہ لے کر انہیں شریعت کے مطابق بنانے کی کوشش کریں، کیونکہ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔

شریعت اسلامی کے جو احکام ہیں ان میں علماء کا فریضہ تو یہ ہے کہ ان کے لئے تحفظ کی اور ان کی تعلیم واشاعت کی جو ضرورت ہو اس کے لئے انفرادی اور اجتماعی طور پر فکر کریں، اور عامۃ المسلمین اور سارے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ احکام معلوم کر کے ان پر عمل کریں، اور اپنی زندگیوں میں ان کو نافذ کریں، اس لئے کہ ان کو نافذ کرنے ہی پر اس دنیا میں عزت ہے، اور آخرت میں کامیابی ہے، اور مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں باتیں رکھی ہیں ایک تو یہ کہ اس دنیا کے اندر بھی ان کو عزت حاصل ہو اور دوسرے یہ کہ آخرت میں بھی ان کو کامیابی اور سرخ روئی حاصل ہو، اور سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور عذاب میں مبتلا نہ ہوں، اور اسی کے ساتھ یہ ہے کہ یہ زندگی بھی عزت وراحت کے ساتھ گزرے لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب ہم اس پر عمل کریں گے، آپ اور ہم سب کا فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کا جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ ہم شریعت اسلامی پر کتنا عمل کر رہے ہیں؟ شریعت اسلامی زندگی کے لئے اسلامی احکام کو کہتے ہیں، یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام، اس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے جو احکام ہیں انہیں کا نام شریعت ہے، لہذا ہم دیکھیں کہ ہم شریعت اسلامی پر کتنا عمل کرتے ہیں، اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں، اور جو نقص اور کمی ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کریں، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس دنیا کے اندر بھی ہم کو عزت اور راحت حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی کامیابی حاصل ہوگی۔

❖ ❖ ❖

فقہی مسالک کا تنوع ایک نعمت ورحمت

ہم شریعت اسلامی پر ذرا وسعت کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں جو کہ قیامت تک چلنے والے دین کی شریعت ہے، اوراس کرۂ ارضی کے سارے انسانوں کے لئے ہے تو ہم کو ایسی حکمت نظر آتی ہے جس سے شریعت اسلامی کے شریعت الٰہی ہونے کا ایسا ثبوت ملتا ہے جیسے نصف النہار میں سورج کے وجود کا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو آسان بتایا اور فرمایا: "الدین یسر"، اور یہ بھی فرمایا کہ اس کو سخت بنا کر کوئی اپنا زور دکھانے کی کوشش کرے گا تو ہار جائے گا، چنانچہ اعتدال کی اور آسان بات کو اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی ہے تا کہ دین پر عمل کرنے میں کسی کو دشواری نہ ہو، اگر یہ چیز نہ ہوتی تو ایک جگہ دین کے بعض احکام پر بآسانی عمل ہوتا اور دوسری جگہ دشوار ہو جاتا، اوراس دین کے عالمی ہونے اور قیامت تک رہنے کی بات پر اعتراض آتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے جو احکام بتائے ہیں ان میں حسب ضرورت رعایتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کرنے میں بعض امور میں مختلف طرز اختیار فرمائے، اور کئی موقعوں پر صحابہؓ کے عمل میں اختلاف کو گوارہ فرمایا، گویا کہ بعض امور میں ان کے بعض اعتبارات کی بنا پر سہولت ورعایت کی گنجائش رکھ دی جس سے ضرورت کے لحاظ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اسی طرح یہ بھی ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کے بعض امور میں صرف طرز اختیار کرنے یا مختلف حکم دینے کو مختلف صحابہؓ نے اپنے اپنے موقعوں پر الگ الگ دیکھا تو الگ الگ بیان بھی کیا، ایسی صورت میں بالکل شروع کے عہد میں ایسے احکام کے سلسلہ میں جو کسی طرح کا فرق محسوس کیا گیا تو ان کی تشریح وتعیین میں علماء کی رایوں میں بھی کچھ فرق ہوا، اس کے نتیجہ میں فقہی مذاہب متعدد بن گئے، لیکن سب کی اصل ایک ہے، اور ان سب کا مرجع خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یا عمل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد یا عمل میں فرق یا ابہام کسی بھول چوک کا نتیجہ نہیں، اللہ کا نبی جو شریعت بیان کرنے والا ہے وہ بھول چوک میں کیسے مبتلا ہو سکتا ہے؟ اور جو شریعت قیامت تک کے لئے دی گئی ہے اس میں نقص کی گنجائش کیسے چھوڑی جا سکتی ہے؟ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ورحمت ہے ہمیں بعض مذاہب فقہیہ میں پانی کی طہارت میں شدت ملتی ہے اور بعض میں رعایت ملتی ہے، اس میں اگر ایک ہی پیمانہ کو قطعی کر دیا گیا ہوتا تو جن علاقوں میں پانی کی شدید کمی ہے وہ سخت دشواری میں پڑتے اگر ان کے لئے پانی کے طاہر ہونے کی شدت لازمی کر دی گئی ہوتی، اور جہاں پانی کا بہتات ہے وہاں اس کے طاہر ہونے میں بہت رعایت ایک غیر ضروری بات ہوتی، اسی طرح سمندر کے کنارے رہنے والوں کے لئے اگر پانی صرف بہت محدود نوع کے پانی کے جانور ہی متعین کر دیئے جاتے تو ان کو دشواری ہوتی جو کہ سمندر و پانی کے مراکز سے دور کے علاقوں کے لئے ہوتی جہاں اس سہولت کا نہ تقاضہ ہے اور نہ ضرورت، احکام میں اس طرح کا تنوع وتوسع جو مختلف روایات یا مختلف صحابہ کے عمل سے ملتا اور اس سے بظاہر اختلاف سامنے آتا ہے دراصل اسلام کی طرف سے ضرورت انسانی کی رعایت اور ہر علاقہ کے لئے اس کی موزونیت ہے، جو اس اختلاف میں ملتی ہے جو احکام کے استنباط میں مختلف مذاہب کے فقہاء کے یہاں پایا جاتا ہے، اور ان سب کی مرجعیت حضور صلی

اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہے جو آپ کے عمل اور حکم یا اسی سے مستنبط ہے، اور مصدر اول کے ایک ہونے کی بنا پر یہ سب تنوع اپنی اپنی جگہ پر حق ہے، اور یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے رعایت اور نعمت ہے، جب مسلک کامل دیانت و امانت کے ساتھ قرآن وحدیث سے اخذ کیا گیا ہو، اور اخذ کرنے والا علم و تحقیق کے لحاظ سے بھی، اور تقوی وللّٰہیت کے اعتبار سے بھی ثقہ ہو تو اس کے عمل کو گمراہی کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ اجتہادی خطا سمجھی جاسکتی ہے، اور اس پر بھی عند اللہ اجر ہے، اس تنوع کو افتراق کا باعث نہ ہونا چاہئے، اور صرف اپنے کو اہل حق اور دوسرے کو ضال قرار نہ دینا چاہئے، یہ بات بہت خیال رکھنے کی ہے، قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے تقریباً اسی طرح کے افتراق اور اپنے سے مختلف کو ایذا پہونچانے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو وحدت اور اسلامی اخوت کی پوری تاکید کی گئی ہے۔

اہل سنت کے معروف ومتداول مذاہب فقہیہ سب حق پر ہیں، خواہ وہ حنفی ہوں، خواہ شافعی اور خواہ حنبلی ہوں یا مالکی، خواہ حنبلی فقہ کے ذیلی فقہ کے ہوں جیسے سلفی، لیکن ان مختلف فقہوں کے ماننے والے مسلکی تعصب میں بعض وقت آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف میں شدت بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جیسے کہ مسئلہ اسلام اور کفر کے درمیان کا ہو، یہ بات بعض وقت بہت افسوس ناک صورت اختیار کرجاتی ہے، اس ٹکراؤ سے یہ امت واحدہ امت واحدہ نہیں رہ جاتی، جب کہ ہر مسلک والا اپنے کو اصل مسلمان اور دوسرے کو گمراہ سمجھتا ہے، اور بعض وقت یہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک نہیں پڑھتے، حالانکہ قرآن مجید میں اور حدیث شریف میں صاف صاف اشارے آئے ہیں اور تاکیدیں آئی ہیں کہ آپس میں متفرق نہ ہو، امت واحدہ بن جاؤ، قرآن مجید میں آیا ہے:

﴿إن هذه أمتكم أمة واحدة وأنا ربكم فاعبدون﴾۔ (الأنبیا:۹۲)

”یہ ہے تمہارا طریقہ کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو تم سب میری عبادت کیا کرو۔“

اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ عقیدہ بتایا گیا ہے کہ:

﴿لا نفرق بين أحد من رسله﴾۔ (البقرۃ:۲۸۵)

”ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔“

حالانکہ ان کی شریعتوں کے احکام میں فرق رہا ہے مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بن کر رہنے کا حکم دیا گیا ہے، بھائی بھائی میں جس طرح معمولی چیزوں میں اختلاف ہوتا ہے لیکن ان کے بھائی ہونے میں فرق نہیں پڑتا اسی طرح قرآن وحدیث سے ایمان واخلاص کی صفت کے ساتھ تحقیق کا عمل اختیار کرنے والے کا اجتہاد حق کے مطابق تسلیم کیا جائے گا، اور اس کے ساتھ معاملہ احترام ولحاظ کا کیا جائے گا، خواہ حقیقت کے لحاظ سے اس میں کوئی اجتہادی غلطی ہوئی ہو، ہمارے اسلاف نے اس کی پابندی کی ہے، اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے تھے: ”مجھے اس سے خوشی نہ ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی اختلاف نہیں رہا، اس لئے کہ اگر وہ کسی امر میں متفق ہو جاتے، پھر ایک شخص آتا اور صحابہ کے قول کی خلاف ورزی کرتا تو وہ گمراہ ہو جاتا، لیکن جب صحابہ میں اختلاف رہا ہے، ایک آدمی ایک قول کو اختیار کرتا ہے دوسرا دوسرے قول کو اپناتا ہے اس میں بڑی گنجائش ہے“۔

ہم کو اپنے لائق اسلاف کے آپس میں اختلاف کرنے اور اپنی اپنی رائے پر جم کر بات کرنے کے باوجود آپس میں محبت کے ساتھ رہنے اور معاملہ کرنے کی خاصی مثالیں ملتی ہیں، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر اصحاب مذہب اور فقہاء ومجتہدین کے حالات دیکھئے تو وہ آپس میں اسی رواداری پر عامل رہے ہیں، ضرورت ہے کہ اسی

طرز کو قائم رکھا جائے ورنہ ہر مذہب اپنے کو اصل حق پر سمجھے گا اور دوسرے کے مسلک کو گمراہی کے مساوی سمجھے گا، اور اس طرح دین اسلام ایک چھوٹے سے مسلک میں محدود ہو کر رہ جائے گا جو کسی طرح خاتم الأنبیاء کی تا قیامت رہنے والی اس عظیم امت کے لئے موزوں نہیں ہے، دین کی بنیادوں پر متفق ہونے کے ساتھ فروعی اور استحبابی امور میں اختلاف آپس میں دشمنی اور بدخواہی کی وجہ نہیں بننا چاہئے، اس کو سارے محقق، سارے علماء اسلاف نے تسلیم کیا ہے، بلکہ اس پر عمل کیا ہے۔

❖ ❖ ❖

جمہوری نظام میں ملت اسلامیہ کی حکمت عملی کیا ہو؟

جمہوری نظام میں ملک کے تمام باشندوں کو انسانی حقوق میں برابری حاصل ہوتی ہے اور ملک کا دستور اس کی ضمانت دیتا ہے، عدالت اس کا کنٹرول کرتی ہے اور اس سلسلے میں اکثریتی اوراقلیتی افراد دونوں کو یکساں حیثیت حاصل رہتی ہے، لیکن اس کا نفاذ خود اکثریت واقلیت کے افراد کی فکر وتوجہ کے مطابق ہی عمل میں آتا ہے، اکثریت کے افراد کو اپنی اکثریت کی بنیاد پر نظام حکومت میں نسبتاً برتری حاصل ہوتی ہے، اس برتری کی بنا پر ثقافتی واقتصادی حقوق کو زیادہ بہتر طریقہ سے حاصل کرنے کا ان کو زیادہ موقع حاصل ہو جاتا ہے، جس کی بنا پر اقلیت کے افراد کو کمی سے سابقہ پڑتا ہے، لیکن اس کمی کو اگر قانونی بنیاد پر وہ دور نہ کرا سکتے ہوں تو اس کو اپنی نجی تدبیروں نیز توجہ اور فکرمندی سے پورا کر سکتے ہیں، دنیا کی بیدار مغز اور حوصلہ مند اقلیتیں اس ضرورت کو محسوس کرتی ہیں اور اپنی ملت کی ضرورتوں کے لئے اپنے نجی غیر حکومتی ذرائع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرگرم عمل ہوتی ہیں، اور اپنی اس ہوش مندی سے اکثریت کے مقابلے میں پیچھے نہیں رہتیں، بلکہ بعض وقت آگے بڑھ جاتی ہیں اس کی مثالیں عہد حاضر میں بھی مختلف ملکوں میں دیکھی جا سکتی ہیں، لیکن اگر کوئی اقلیت حالات کا [illegible]زہ لینے میں کوتاہی کرتی ہے اور اس کے رہنما حقیقت پسندی سے دور

اور ذمہ داروں کی ظاہرداریوں پر اعتماد کر لینے والے اور حالات کے مطابق طرز عمل اختیار نہ کرنے والے ہوتے ہیں تو اقلیت اپنے ملکی اور انسانی حقوق کے حصول میں بے توجہی کا شکار ہوتی ہیں، اور اکثریت کے مقابلہ میں پیچھے چلی جاتی ہیں، ہندوستان بھی ان ملکوں میں ہے جہاں اکثریت و اقلیت کا معاملہ توجہ چاہتا ہے، یہاں مسلمان قابل ذکر اقلیت میں ہیں اور یہ اقلیت معمولی نہیں بلکہ بڑی اقلیت ہے، جس کی اپنی مذہبی، تہذیبی اور سماجی قدریں ہیں، اور یہ قدریں ایسی ہیں کہ ان سے دست بردار نہیں ہوا جا سکتا، وہ کوئی محدود یا مقامی حیثیت کی سماجی اکائی نہیں ہیں کہ اپنے اردگرد کے ماحول میں ضم ہو جائیں، وہ اپنی وسیع اور بین الاقوامی برادری رکھتے ہیں، جس سے ان کے مذہبی اور اخلاقی طور پر بنیادی روابط ہیں وہ اپنی اس برادری سے بالکل بے تعلق نہیں ہو سکتے، اور انھوں نے اپنی ماضی کی تاریخ میں جو مخصوص علمی و تہذیبی ورثہ پایا ہے اس سے بھی دستبردار نہیں ہو سکتے، لیکن مقامی لحاظ سے وہ ملک کی اکثریت کے ساتھ ہیں جو وطنی وابستگی رکھتے ہیں اور ملک کا جو مشترک دستور ہے وہ اس کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کے پوری طرح پابند ہیں، لہذا دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کو ملک کا دستور جو حقوق دیتا ہے ان کو ہم جمہوری اصولوں کے مطابق کس طرح حاصل کر سکتے ہیں اور ہماری ضرورت کی تکمیل میں جو کمی ہوتی ہو اس کو ہم کس طرح دور کر سکتے ہیں۔

ہماری سب سے بڑی ضرورت ملک کے اندر اپنی باعزت زندگی قائم کرنے اور اس کو بہتر بنانے اور ترقی کی موجودہ دوڑ میں پیچھے نہ رہنے کے لئے جو امکانات اور وسائل ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کی ہے، ہم کو دیکھنا ہے کہ اس میں ہماری صورت حال کیا ہے اور ہم کو کیا کرنا ہے، حصول آزادی کے بعد ملک ترقی کے راستہ میں ہے، ہم کو دیکھنا ہے کہ اس میں ہمارا کیا حصہ ہے اور ترقی کے حصول اور قومی و اخلاقی زندگی

میں بہتر صورت حال حاصل کرنے میں ہمارا کیا مقام ہے، حقیقت احوال کے سلسلہ میں ہم کو سنجیدہ اور تعمیری انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اس میں صرف حق تلفی کرنے والوں کے خلاف محض آواز اٹھانے سے مسئلہ بہت کم حل ہوتا ہے، آواز اٹھانا غلط نہیں ہے البتہ اس سے زیادہ ٹھوس عملی کوششوں کی ضرورت ہے، اس کے لئے ہم کو تعلیم کے نجی ذرائع اور ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال اور ہم وطنوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرنے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کرنا چاہئے، اس وقت ملک کے اندر شکوہ شکایت، خود غرضیوں اور فرقہ وارانہ ٹکراؤ کا جو ماحول بن گیا ہے اس کو ہم مذکورہ بالا طریقوں سے بہت حد تک دور کر سکتے ہیں اور اس کے ذریعہ ہم اپنے جمہوری اور وطنی حقوق کو زیادہ بہتر طریقہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اس وقت مسلمانوں کو سب سے زیادہ جس چیلنج کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے مذہبی اور ملی تشخص کو مٹانے اور ان کے تاریخی کردار کو بگاڑ کر پیش کرتے ہوئے ان کو ایک تشدد پسند ملت قرار دیا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں ان کی تاریخی اور مذہبی یادگاروں و آثار قدیمہ کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم ان کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے ایک طرف ذرائع ابلاغ کو مؤثر ڈھنگ سے اختیار کریں، اور دوسری طرف ادبی و ثقافتی سیمیناروں اور اخلاقی ملاقاتوں اور گفتگو کے ذرائع سے بھی کام لیں، اس سے کم از کم معاندانہ مقصد نہ رکھنے والے ذہنوں کی غلط فہمیاں دور کی جا سکتی ہیں، کوئی بھی قوم ہو اس میں معتدل سوچ رکھنے والوں ہی کی اکثریت ہوتی ہے جن کو صورت حال سے نہ صرف واقف کرایا جا سکتا ہے بلکہ ہم نوا بنایا جا سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ معاندانہ ذہنیت کی کارفرمائی کا مقابلہ قانونی ذرائع سے بھی کیا جا سکتا ہے اس طریقہ کار کا فائدہ ان کے خلاف محاذ آرائی اور ٹکراؤ کے طریقوں

کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے کیوں کہ رائج الوقت ٹکراؤ فریق مخالف میں بھی ٹکراؤ اور جوش پیدا کر دیتا ہے اور چونکہ اقلیت و اکثریت کے مابین جو تناسب ہے اس سے وہ مسلمانوں کے حق میں نہیں جاتا لہذا مسلمان نقصان اٹھاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تدابیر کے پہلو کو اختیار کرنے کے ساتھ رضائے الٰہی کے حصول کے پہلو کی طرف بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، افسوس کی بات ہے کہ حرام مال اور ناجائز اعمال میں آلودگی مسلمانوں کے معاشرہ میں بہت عام ہو گئی ہے، اس کو بدلنے کی طرف پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ قومی اور انفرادی دونوں طرح سے حالات خدا کے علم و اختیار کے دائرہ میں ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی اس کی رضا کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

❖ ❖ ❖

تقوائے الٰہی مومن کا شعار ہے[1]

﴿یا أیها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة، وخلق منها زوجها، وبث منهما رجالاً کثیراً ونساءً، واتقوا الله الذی تساءلون به والأرحام، إن الله کان علیکم رقیباً﴾

(سورہ نساء:۱)

”اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا، اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں، اور تم خدائے تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کیا کرتے ہو، اور قرابت سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔“

﴿یا أیها الذین آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولا تموتن إلا وأنتم مسلمون﴾ (سورہ آل عمران:۱۰۲)

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو ڈرنے کا حق، اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔“

﴿یا أیها الذین آمنوا اتقوا الله، وقولوا قولاً سدیداً، یصلح لکم أعمالکم ویغفرلکم ذنوبکم، ومن یطع الله ورسوله فقد

(۱) عقد نکاح کے موقع پر دیا گیا خطبۂ مسنونہ۔

فاز فوزاً عظیماً﴾ (سورہ احزاب: ۷۰-۷۱)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور راستی کی بات کہو، اللہ تعالیٰ (اس کے صلہ میں) تمہارے اعمال کو قبول کرے گا، اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا سو وہ بڑی کامیابی کو پہونچے گا۔"

نکاح کے خطبہ میں ان آیات کا پڑھنا مسنون ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ آیات بڑی جامع اور معانی سے لبریز ہیں، اور ان کا انتخاب بڑی حکمت پر مبنی ہے، ان میں تخلیق انسانی، افزائش نسل آدم، رشتہ داری وقرابتداری، خاتمہ بالخیر کی فکر، نکاح کا قول وقرار اور اللہ ورسول کی اطاعت وفرمانبرداری اور سب سے مقدم اور سب سے ضروری چیز اللہ کا تقوی اور اس کا ڈر یہ ساری چیزیں آ گئی ہیں، اور اگر انسان ان کے سلسلہ میں قرآنی تعلیمات پر عمل کرے تو اس کی زندگی بہتر انداز میں گذر سکتی ہے، اور دنیا ہی میں جنت کا نمونہ بن سکتی ہے۔

پہلی آیت سورہ نساء کی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنی ذات سے ڈرنے کا حکم دیا، پھر انہیں ان کی خلقت یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک جاندار یعنی حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے پیدا فرمایا جس کی بنیاد پر انہیں ابوالبشر کہا جاتا ہے، پھر چونکہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں نسل انسانی کو پھیلانا اور بڑھانا مقصود تھا اس لئے حضرت آدم علیہ السلام سے ہی ان کا جوڑا یعنی حضرت حواء علیہا السلام کو پیدا فرمایا، جس سے حضرت آدم علیہ السلام کی تنہائی بھی دور ہوئی اور نسل انسانی بھی چلی، اور دنیا میں اربوں کھربوں مرد وعورت پیدا ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، اور انشاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو بڑھانے اور چلانے کا ایک مخصوص نظام بنایا ہے، ان کے اندر جنسی خواہش بھی اسی مقصد سے رکھی گئی ہے، اور اس کو جائز طریقہ

سے پورا کرنے کا نظم بھی کیا گیا ہے جس کا نام نکاح ہے، ساری مہذب قوموں میں شکلوں کے اختلاف کے باوجود یہی طریقہ رائج ہے، حیوانوں کی طرح انہیں جنسی خواہش کی تکمیل میں آزاد نہیں چھوڑا گیا ہے، اور پھر نکاح اور شادی بیاہ کے نتیجہ میں نئے نئے رشتے اور قرابت داریاں وجود میں آتی ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کا بھی پاس ولحاظ اور رعایت کرنے کا حکم دیا کہ اب تمہارا نیا رشتہ ہو رہا ہے، تم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو رہے ہو تو دیکھو خیال رکھنا، اس سے پرانے رشتے ختم نہیں ہو جاتے، تمہارے ماں باپ ہیں، بھائی بہن ہیں، چچا اور ماموں ہیں وغیرہ وغیرہ، یہ پرانے رشتے ہیں، ان کے مقابلے میں کچھ نئے رشتے تمہارے سامنے آرہے ہیں، تمہاری بیوی ہے، جس سے رشتہ ہونے کے نتیجہ میں ساس سسر ہوں گے، برادر نسبتی ہوں گے، تو ان نئی رشتہ داریوں کے چکر میں پڑ کر تم اپنے خاندان کے پرانے رشتوں کو بھول مت جانا اور ان کی حق تلفی نہ کرنے لگ جانا، بلکہ اب تم پر دوہری ذمہ داری عائد ہو رہی ہے، تمہیں نئے اور پرانے سبھی رشتوں کا خیال رکھنا ہے، اور سب کے حقوق ادا کرنے ہیں، اور دیکھوں اللہ سے ڈرتے رہنا، جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، نکاح بھی ایک سوال ہے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے اور اسی کے نام کی برکت ہے کہ کل تک جو عورت تمہارے لئے اجنبی اور حرام تھی اب وہ تمہارے لئے حلال ہوگئی، اور تم نے اللہ کے واسطے سے اس کے ماں باپ اور گھر والوں سے اس کا رشتہ مانگا تو انہوں نے منظور کرلیا، اور تمہارے ساتھ اس کی شادی کردی، لہذا تمہیں چاہئے کہ تم اللہ تعالیٰ اور رشتے ناطے سب کا خیال رکھنا، اور یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے حالات اور تمہاری نیتوں اور کاموں سب سے باخبر ہیں، تم انہیں کسی حال میں بھی دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دوسری آیت سورہ آل عمران کی ہے، موقع ہے خوشی و مسرت کا، ہر طرف

خوشی کے شادیانے اور شہنائیاں بج رہی ہیں، ایسے موقع پر اللہ سے ڈرنے اور آخرت اور موت کو یاد کرنے اور یاد دلانے کی بات کسی پیغمبر اور رسول ہی کے شایان شان ہے، چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خوشی کے موقع پر اس آیت کا بھی انتخاب کیا جس میں فرمایا گیا ہے کہ بھائیو! یہ دنیا چند روزہ ہے، اس کی خوشیاں اور مسرتیں آنی جانی ہیں، یہاں کی لذتیں فانی ہیں، اصلی اور حقیقی مسرت ولذت تو آخرت میں نصیب ہوگی لیکن اس کے لئے ایمان شرط ہے، لہذا تم اس خوشی کے موقع پر آخرت کو بھول مت جانا، اور اپنے ایمان کی طرف سے غافل مت ہو جانا، بلکہ اس کی فکر رکھنا اور اس بات کا اہتمام کرنا کہ تمہارا خاتمہ ایمان پر ہو، اور ایمان کی حالت میں موت آئے، اور یہ جب ہی ہوگا جب تم اپنی پوری زندگی میں ایمان والے کام کروگے، اور اس کی فکر اور اہتمام رکھوگے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ کہاں خوشی کا موقع اور کہاں موت کا تذکرہ؟ اللہ اکبر! یہ کسی رسول ہی کی زبان سے نکل سکتا تھا جو زندگی کا ایک کامل ومکمل دستور لے کر آیا ہو، اور جو زندگی کے ہر موڑ پر انسانوں کی رہنمائی کرتا ہو۔

تیسری آیت جو اس موقع پر پڑھی جاتی ہے وہ سورہ احزاب کی آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے ساتھ اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ تم اپنے منھ سے سچی اور پکی بات نکالو، تم اپنے سر ایک بڑی ذمہ داری لے رہے ہو، لہذا تم خوب اچھی طرح اس ذمہ داری کو سمجھ لو، اور سمجھ کر ہی منھ سے کوئی بات نکالو، تم اپنی بیوی کے ساتھ زندگی بھر رہنے، ساتھ دینے اور ساتھ نبھانے کا قول وقرار کر رہے ہو تو دیکھو اس میں خلل نہ پڑنے پائے، اسے تم پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھانا، اور تم جب اپنی زبان کا، اپنے وعدہ اور اپنے قول وقرار کا پاس ولحاظ کروگے اور اسے پورا کروگے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد ہوگی، وہ تمہارے کام بنائیں گے، تمہاری حالت درست

فرمائیں گے، اور جو بھول چوک اور غلطی تم سے ہو گی اسے معاف فرما دیں گے۔

اور دیکھو ان باتوں پر عمل کرنے اور انہیں پورا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے، اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایات اور تعلیمات تم تک پہونچائی ہیں، لہذا ان پر عمل کرنا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو اسے دنیا و آخرت میں بڑی کامیابی ملے گی۔

اس موقع پر غور کرنے کی بات ہے کہ ان تینوں آیتوں کا آغاز ﴿اتقوا الله﴾ سے ہوتا ہے، یعنی اللہ سے ڈرو، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تقوائے الٰہی اور خوف وخشیت خداوندی ہی سارے اچھے کاموں کے کرنے اور برائیوں سے بچنے کی اصل ہے، انسان کے دل میں اگر خوف الٰہی ہو تو ہر موقع پر اسے فکر ہوتی ہے کہ اس موقع پر شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور اللہ کی مرضی کیا ہے؟ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کیا ہے؟ اس سے وہ غلط کاموں سے خود بخود رک جاتا ہے، اور نیک کاموں کی طرف اسے رغبت ہوتی ہے، لہذا ایک مومن کو تقوائے الٰہی کو اپنا شعار اور حرز جان بنالینا چاہئے۔

❖ ❖ ❖